قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا تہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

جنوری 2016ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (39:69)

آسمان نے خوش بخت زمین کی بارگاہِ عالیہ میں جھک جھک کر ہدیۂ تبریک وتہنیت پیش کیا، نوامیسِ فطرت نے ''جنت سے نکالے ہوئے آدم'' کے اس طالع بیدار کا تقدیس وتحمید کے زمزموں سے استقبال کیا، دنیا سے طاغوتی قوتوں کے تخت الٹ گئے کہ وہ آنے والا آ گیا جس کی آمد ملوکیت وقیصریت کے لیے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتشکدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ اب سے انسانی تصورات کی دنیا نار کی جگہ نور سے منور ہوگئی، دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہو گئے کہ آج مسلک ابراہیمی کی تکمیل کا دن آ گیا، شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا کہ اب جور واستبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کا وقت آ گیا۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دور ہوگئیں کہ آج اس آفتاب عالم تاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے ''جگمگا تا چراغ'' کہہ کر پکارا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ (33:45-46)

آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا کہ

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ (7:157)

جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال وسلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا۔ جن میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔

(سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر پرویز صاحب کی کتاب ''معراج انسانیت'' کے باب ''صبح بہار'' سے ایک اقتباس)

جلد 69 شمارہ نمبر 01 جنوری 2016ء

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت: ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق، خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

اس شمارے میں

لمعات: بتقریب سعید عید میلاد النبی	ادارہ	4
پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت (قسط چہارم)	منظور حسین لیل	11
قرآنِ کریم کی روشنی میں آخرت کی زندگی	ڈاکٹر اعجاز رسول	20
میثاقِ مدینہ	محمد اکرم راٹھور	32
تحریک طلوعِ اسلام کا بلند مقام	خواجہ ازہر عباس	38
ایک بار پھر اقبال	عطاء الحق قاسمی	47
باب المراسلات	ڈاکٹر انعام الحق	50

ENGLISH SECTION

Surah *Al-Takwir* (التکویر) – *Durus-al-Qur'an* By G.A.Parwez
Parah 30: Chapter 14 Translated by: Dr. Mansoor Alam 58

زرِ تعاون	50 روپے فی پرچہ
پاکستان	-/550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک	-/800 روپے سالانہ
بیرون ملک	-/2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک	-/4000 روپے سالانہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465-22-003082-7

For International Transactions
IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827
Swift Code : NBPAPKKAA02L

National Bank of Pakistan Main Market, Gulbarg Lahore

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ نمبر 2، لاہور۔ 54660، (پاکستان) فون: 042-35714546

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہوجا
ہوس نے کردیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہوجا، محبت کی زباں ہوجا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم! اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سر زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ وبیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

لمعات

بتقریب سعید عید میلاد النبی

نذرِ عقیدت بدرگاہِ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(1) وہ آئے بزم میں:

شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب وتمدن کے پھول وحشت و بربریت کی بادسموم سے مرجھا چکے تھے۔ حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جوہرِ انسانیت کی سرسبزی وشادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ کشتِ مذاہب واخلاق کے حدود تو باقی تھے لیکن فصلیں بالکل اجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت وسراسیمگی کے عالم میں، خاسر و نامراد انسان، اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا، لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس وناامید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار پکار کر کہتی تھیں کہ مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ ط! (2:214) یہ وقت تھا کہ فطرت کے اٹل قانون نے اس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا۔

اس رب ذوالمنن کا سحاب کرم، زندہ اُمیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزاروں جنتیں اپنے آغوش میں لئے، ربیع الاوّل کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر آیا اور بلدامین کی مبارک وادیوں میں کھل کھلا کر برسا۔ انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ اخلاق وتمدّن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آ گئی۔ عمرانیت ومدنیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہو گئی۔ اعمال صالحہ کے خشک چشمے، حیات تازہ کی جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی وسرکشی کی بادسموم، عدل واحسان کی جان بخش نسیم سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرّتوں کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارک باد دی کہ تیرے بخت بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذروں کو اس ذات اقدس واعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پابوسی کی سعادت نصیب ہو گئی جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ جس سے شرف ومجدّ انسانیت کی تکمیل ہو گئی۔ جو علم وبصیرت کے اس افق اعلیٰ پر جلوہ بار ہے جہاں عقل وعشق، ناسوت ولاہوت یہ اور وہ قوسین کی طرح آپس میں ملتے ہیں۔ جو دانشِ روحانی اور حکمتِ برہانی کے اس مقام بلند پر فائز ہے جہاں

غیب وشہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آجاتی ہیں۔ نوامیسِ فطرت نے، جنت سے نکالے ہوئے ابن آدم کے اس طالع بیدار کا تقدیس وتحمید کے زمزموں سے استقبال کیا۔ دنیا کے طاغوتی قوتوں کے تخت الٹ گئے کہ وہ آنے والا آ گیا جس کی آمد ملوکیت وقیصریت کے لیے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتش کدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ اب انسانی تصوّرات کی دنیا، نار کی جگہ نور سے معمور ہوگئی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہوگئے کہ آج مسلکِ ابراہیمیؑ کی تکمیل کا دن آ گیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا کہ اب جور واستبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کا وقت آ گیا۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دور ہوگئیں کہ آج اس آفتاب عالم تاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے جگمگاتا چراغ کہہ کر پکارا۔۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (33:45-46) وہ آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ (7:157) جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال وسلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا۔ جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ احبار ورہبان کی برہمنیت کے طوق وسلاسل، قیصر وکسریٰ کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں، تقسیم انسانیت کے انسانیت کش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے اور پابندِ قفس، طائرِ لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں، اذنِ بال کشائی عطا ہوا۔ اور انسان ایک بار پھر زمین پر سر اونچا کر کے چلنے کے قابل ہوگیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی۔ عقل کو عشق کا جنون اور عشق کو عقل کی فرزانگی عطا ہوئی۔ فقر کو شکوہ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے قلندری عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذاتِ گرامی کہ:

محبت از نگاہش پائدار است
سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدہٗ آمد و لیکن
جہانِ شوق را پروردگار است

اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ (30:50)

اس طرح وہ دلوں کی مردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

(معراج انسانیت از پرویز طبع اوّل صفحہ 172:171)

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا:

جب مشیتِ ایزدی کی تدبیر محکم، جس کے لیے زمین وآسمان یوں قرنہا قرن سے سرگرداں پھر رہے تھے، اپنی پختگی تک

پہنچی۔ جب انسانیت، جس کے لیے کائنات نے ایک ایک ذرّے کو لاکھوں چکر دیئے تھے، گہوارۂ طفولیت سے حریم شباب میں آ گئی۔ جب اس صحیفۂ فطرت کی تکمیل کا وقت آ گیا جس کے مختلف اوراق ستاروں کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرمریں روشنی میں کوثر و تسنیم سے دھلے ہوئے قلم سے لکھے گئے تھے۔ جب سینۂ کائنات میں اتنی کشادگی پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے اندر راز ہائے درون پردہ کے معدنِ لعل و گہر کو سمو لے، تو آسمان کی حوریں زمین پر اتریں کہ جنت کے تر و تازہ پھولوں سے وادیٔ بطحا کی تزئین و آرائش کر دیں۔ صحنِ گلستانِ کائنات پر بہار آ گئی ہر طرف سے مسرتوں کے چشمے ابلنے لگے۔ چاند مسکرایا، ستارے ہنسے۔ آسمان سے نور کی بارش ہوئی۔ فرشتوں کی معصوم نگاہوں میں اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (2:30) کی تفسیر، ایک پیکرِ محبوبیت کا حسین تصور بن کر چمکنے لگی۔ فلک تعظیم کے لیے جھکا۔ زمین نے اپنی خاک آلود پیشانی سجدہ سے اٹھائی کہ آج اس کی قرنہا قرن کی دعاؤں کی قبولیت کا وقت آ پہنچا تھا۔ صحرائے حجاز کے ذرّے جگمگا اٹھے۔ بلد امین کی گلیوں کا نصیبہ جاگا کہ آج اس آنے والے کی آمد آمد تھی۔ جس کی طرف جبل تین پر حضرت نوحؑ نے ارشاد کیا تھا اور جسے کوہ زیتون پر حضرت مسیحؑ نے اپنے حواریوں کو وجہ تسکین خاطر بتایا تھا۔ جس کی آمد کی بشارتیں وادیٔ طور سینین میں بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں اور جس کے لیے دشتِ عرب میں حضرت خلیل اکبرؑ اور ذبیح اعظمؑ نے اپنے خدا کے حضور دامن پھیلایا تھا۔ وہ آنے والا، کہ جس کے انتظار میں زمانے نے لاکھوں کروٹیں بدلی تھیں آیا، اور اس شانِ زیبائی و رعنائی سے آیا کہ زمین و آسمان میں تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے۔ فرشتوں نے زمزمۂ تبریک گایا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی حدود فراموش شاخوں نے جھولا جھلایا۔ ملاء اعلیٰ کی مقدس قندیلوں نے چراغاں کیا۔ کائنات کے ذرّے چمک اٹھے۔ فضائے عالم درود و صلوٰۃ کی فردوسِ گوش صداؤں سے گونج اٹھی اور انس و جان وجد و کیف کے عالم میں پکار اٹھے کہ ؎

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
در جہانِ ذکر و فکر و انس و جاں
تو صلوٰۃ صبح، تو بانگ اذاں

(معراج انسانیت طبع اوّل صفحہ 173-174)

مقامِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم :

یہ آنے والا رسول کافۃً للناس اور رحمۃ اللعالمینؐ بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی صداقت جہاں کہیں بھی تھی اس کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو حضورؐ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیل آسمانی کی کوئی نہ

کوئی کرن تھی جو قلبِ محمدیؐ میں اتاری گئی۔ مشامِ جان نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی انہی پتیوں کی رہین منت تھی جن کا گل دستہ اس نبی آخر الزمانؐ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔

پیغامِ محمدی کیا ہے؟ انہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی آندھی کے تیز جھونکوں نے صحن کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور

مقامِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کیا ہے:

ان ہی درخشندہ و تابندہ ذرّاتِ نادرہ کا پیکرِ حسن و زیبائی کہ جن کی حقیقتِ آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی فرطِ عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جوہر الگ الگ پڑے تھے، اور یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال اب سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے اور یہاں یہ ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہو گئے تھے جو ضمیر کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے، یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں یہ پھول تھا۔ وہ ذرّے تھے، یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے، یہ کہکشاں تھی وہ افراد تھے، یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے، یہ خط مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی، یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا است
رحمۃ للعالمینی انتہا است

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیِ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے نقوش جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیکھنے سننے والا پکار اُٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰؐ رو

(معراجِ انسانیت، طبع اوّل، صفحہ 175)

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (93:7)

طلسم نہایتِ آں کہ نہایتے نہ دارد
بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے

قلبِ وادیٔ فاران، یعنی ام القریٰ مکہ، اپنی تمام نگاہ فریب جاذبیتوں کے ساتھ، ہر عاکف و باد کے لیے مرکز قلب ونظر بنا ہوا ہے۔ چونکہ ریگ زار حجاز کے ہر ذرہ کی عقیدت حریم کعبہ کے ساتھ وابستہ ہے، اس لیے طفلک و برنا و پیر، نزد و دُور، کارواں در کارواں اپنی پیشانیوں میں تڑپتے ہوئے سجدوں کے نذرانے لیے، رواں دواں اور کشاں کشاں اس مرجع انام کی طرف چلے آرہے ہیں۔ جبینِ شوق سجدوں سے معمور ہے لیکن کچھ معلوم نہیں کہ مسجود کیا ہے؟ قلب نیاز جذبہ ہائے تعبد سے لبریز ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ معبود کون ہے؟ زندگی کی تگ وتاز بہر نوع ہنگامہ خیز ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ اس تگ وتاز سے مقصود کیا ہے؟ کاروانِ حیات تیز گام ہے لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کی منزل کونسی ہے؟ لیکن اس نہ جاننے کے باوجود ایک ہنگامہ ہے کہ ہر وقت برپا ہے جس میں ہر شخص اپنے آپ کو جذب کیے ہوئے ہے۔ اس کیف و مستی کے عالم میں کوئی تالیاں پیٹتا ہے، کوئی سیٹیاں بجاتا ہے۔ کوئی کعبہ کے گرد گھوم گھوم کر، سفر ختم ہونے کے باوجود ذوقِ سفر کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ کوئی بتوں کے آستانوں پر جانور ذبح کر کے ان کا گرم گرم لہو پی رہا ہے۔ کوئی زم زم کے کنارے بیٹھا جام وسبو کے امتیازات مٹا رہا ہے۔ کاہنوں کے گرد عورتوں کا ہجوم ہے جو صبر گریز پا اور رنجِ گراں نشیں کے جگر سوز افسانوں کا مستقبل معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ اِدھر عکاظ کے بازار میں شعرائے جادو بیاں اپنی سحر آفرینیوں سے ہر سننے والے کے دل کو اپنی مٹھی میں لیے ہوئے ہیں۔ کبھی کسی کے خاندانی مفاخر کے تذکرے سے اس کے طرہ استکبار میں اور بالیدگی پیدا کرتے ہیں اور گاہ کسی کے عزیز کے قتل کی یاد تازہ کر کے اس کی رگوں میں آتشِ انتقام کے شعلے اس طرح بھڑکاتے ہیں کہ بزم شعر خوانی آن کی آن میں رزم گاہ بن جاتی ہے۔ لیکن محفلِ عیش وطرب ہے یا میدان جنگ وجدل ہر شخص پورے جذب وانہماک سے اس میں حصہ لیتا ہے اور اس ہمہمہ اور طنطنہ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر، یوں مستغرق ہوتا ہے کہ کوئی کشش اسے اس ہنگامے سے باہر نہیں لے جاسکتی۔ چھوٹا بڑا، امیر غریب، مرد، عورت، سب ان ہنگاموں میں اس طرح شریک ہیں گویا یہ چیزیں ان کی معاشرت کا جزو اور ان کی قومی زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔

ایک استثناء:

لیکن مکہ کی ان پر ہجوم گلیوں میں ایک شخص ایسا بھی دکھائی دیتا ہے جو ان میں سے ہوتے ہوئے بھی ان میں کا معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی طرزِ معاشرت، وضع قطع، تراش خراش سب انہی جیسی ہے۔ وہ انہی بازاروں میں پھرتا ہے۔ انہی لوگوں کے سے کاروبار کرتا ہے۔ ان کی شادی اور غم میں شریک ہوتا ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں جن کی پرورش بطریق احسن کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو انہی جیسا انسان سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی زندگی میں کچھ خلا سا محسوس کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ وہ خلا کیا ہے اور کس طرح پُر ہوسکتا ہے۔ وہ مشاغل ومشارب، جو اس کی قوم کا جزو زندگی بن چکے ہیں، اس کے لیے کوئی جاذبیت نہیں رکھتے۔ وہ بھی اپنی جبینِ نیاز میں ذوقِ عبودیت کے سجود رقصاں لے کر حرم تک جاتا ہے لیکن وہ ان گہرہائے تابندہ کو اسی

طرح واپس لے آتا ہے کہ اسے وہاں انسانوں کی بنائی ہوئی کوئی چوکھٹ اس متاعِ گران مایہ کے شایانِ شان دکھائی نہیں دیتی۔ جب وہ انسانوں کی گردنوں کو ان کی اپنی بنائی ہوئی مٹی اور پتھر کی مورتیوں کے سامنے جھکا ہوا دیکھتا ہے، تو محوِ حیرت رہ جاتا ہے کہ۔۔۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ وہ عکاظ کے بازار میں جب سردارانِ قریش کو اپنی عالی نسبی پر فخر کرتے دیکھتا ہے تو ہر چند وہ خود قریش کے ممتاز ترین گھرانے کا فرد ہے، لیکن اس کا دل گواہی نہیں دیتا کہ جس چیز میں انسان کے اپنے اعمال کو کوئی دخل نہ ہو وہ باعث فخر و تکبر ہو سکتی ہے۔ وہ بزمِ مے پرستی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا کہ اس سے اس کی فطرتِ سلیم اِبا کرتی ہے۔ وہ قمار خانوں کی طرف قدم نہیں اُٹھاتا کہ وہاں اسے مہذب انسانوں کے بھیس میں رہزن دکھائی دیتے ہیں۔

تلاشِ حقیقت:

وہ جب ان محافل و مجالس میں اپنے لئے کوئی تسکین نہیں پاتا تو عیسائی رہبان اور یہودی احبار کی طرف رجوع کرتا ہے کہ اس نے سن رکھا ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کا علم رکھنے کے مدعی ہیں۔ وہ خود لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اس لیے ان علماء و مشائخ سے پوچھتا ہے کہ ان کے پاس کونسی روشنی ہے جسے وہ آسمانی کہہ کر پکارتے ہیں لیکن اسے ان مزعومہ آسمانی شمعوں پر انسانی ساخت کے ایسے ایسے فانوس نظر آتے ہیں جنہوں نے شمع کی اصل روشنی کو بالکل ڈھانپ رکھا ہے۔ وہ یہاں سے بھی ٹھنڈی آہ بھر کر اٹھ آتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ انہی بستیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اس کی طرح ان معبودانِ باطل سے متنفر ہیں۔ وہ ان کی طرف رُخ کرتا ہے کہ شاید وہیں وہ سکون مل جائے جس کی اسے تلاش ہے۔ لیکن اسے ان کا ذوق تشنہ اور تڑپ خام نظر آتی ہے۔ وہ وہاں سے بھی مایوس واپس آتا ہے۔ غرضیکہ وہ انسانوں کے اس ہجوم میں اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے۔ اسے کوئی ایسا دوسرا انسان نہیں ملتا جس سے اپنے دل کی تپش و خلش اور سوز و گداز کا حال کہہ سکے۔ وہ اس تنہائی سے اکتا جاتا ہے تو آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر پکار اٹھتا ہے کہ ؎

دریں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر
کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

تفکر و تدبّر:

وہ انسانوں کی بستیوں میں اپنے دل کی پکار کا کوئی جواب نہیں پاتا تو باہر فطرت کی کھلی فضاؤں میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کبھی صحراؤں کی ناپیدا کنار وسعتوں پر غور کرتا ہے اور کبھی آسمانوں کی حدود فراموش پہنائیوں پر۔ گاہ اسے ستاروں کی تابندگی دعوتِ غور و تفکر دیتی ہے اور گاہ ماہ عالمتاب کی درخشندگی اس کے لیے سامان تدبر و تفحص پیدا کرتی ہے۔ وہ مظاہرِ فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں پر غور کرتا اور بار بار اپنے دل سے سوال کرتا ہے کہ یہ عظیم الشان سلسلۂ کائنات کس طرح وجود میں آ گیا؟ کون اسے بایں حسن و خوبی چلا رہا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ سوالات رہ رہ کر اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اسے

ان کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ جب جواب نہیں ملتا تو اس سے اس کے دل کا اضطراب اور بڑھ جاتا ہے اور جب اضطراب بڑھتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تشنگیِ ذوق کی شدت تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے اپنے آپ پر ضبط اتنا ہے کہ وہ اس کاوشِ اضطراب کو اپنے معمولاتِ زندگی پر قطعاً اثر انداز نہیں ہونے دیتا وہ اپنے کاروباری معاملات، بال بچوں کی نگہ داشت و پرداخت، رفقاء واحباب سے میل ملاقات۔ معاشرتی زندگی کے مقتضیات میں کوئی فرق نہیں آنے دیتا اور ایسی زندگی بسر کئے جاتا ہے کہ اس کے ابنائے جنس اپنے میں اور اس میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے بجز اس کے کہ وہ اس کے کیریکٹر کی بلندی کے مدّاح ہیں اور اس کی صداقت و دیانت کے معترف۔ چھوٹا بڑا سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ قوم اور خاندان کو اس کی شرافت واصالت پر ناز ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو ان سے کچھ مختلف محسوس کرتا ہے اس لیے کہ جن گوشوں کو انہوں نے اپنے لیے وجہ اطمینان اور موجبِ تسکین قرار دے رکھا ہے وہ ان میں سے کسی میں بھی اپنے اضطراب کا مداوا نہیں پاتا۔ وہ اپنے آپ کو ہر وقت کسی ایسی چیز کی تلاش میں مضطرب (بے قرار) پاتا ہے جس کا اسے خود بھی علم نہیں کہ وہ کیا ہے! کارلائل کے الفاظ میں۔

''شروع ہی سے چلتے پھرتے آپ کے دل میں ہزاروں سوالات پیدا ہوتے تھے۔''

میں کیا ہوں؟

کائنات کا لامتناہی سلسلہ کیا ہے؟

زندگی کیا ہے؟

موت کیا ہے؟

مجھے کس چیز پر ایمان رکھنا چاہئے؟

حرا اور فاران کی پہاڑیاں، ریت کے ٹیلوں کا سکوت، ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ ان سوالات کا جواب انسان کی اپنی روح اور خدا کی وحی سے ملنا تھا جو اس روح کو اپنا مسکن بنالے۔

(HEROES AND HERO - WORSHIP P.49)

ہاں، ان سوالات کا جواب کہیں سے نہیں مل سکتا۔ ان کا جواب صرف وحی کی زبان سے مل سکتا تھا۔ اور نبی قبل از نبوّت وحی سے واقف نہیں ہوتا ❶۔ یہی کیفیت قبل از رسالت حضور ﷺ کی تھی۔۔۔۔

(معراج انسانیت طبع اوّل صفحہ 187-188)

---

❶ نبوّت خالصۃً خدا کی موہبت ہوتی تھی جس میں ہونے والے نبی کے اپنے ملکہ، یا کسب وہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ خدا جس ذات کو اس منصب جلیلہ کے لیے منتخب کر لیتا تھا، اسے اپنے پروگرام کے مطابق، ایک وقت معینہ پر نبوّت عطا کر دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نبی کو قبل از نبوّت، وحی کا علم نہیں ہوتا تھا۔ (حضور ﷺ کے بعد نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا)۔

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

(قسط چہارم)

پرویز صاحب کا نظریۂ اسلامی مملکت

(قرآنی حکومت)

اور جو لوگ ما انزل اللہ (قرآن) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی لوگ کافر، ظالم، فاسق ہیں (47۔45۔44/5)۔

نظامِ سیاست

شرف وتکریمِ انسانیت:

طلوعِ اسلام اپریل 1984ء۔ص۔53:۔ ''قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ جب وہ کوئی اصول یا قانون دیتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیتا ہے کہ ایسا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ اس کی غرض وغایت اور حکمت کیا ہے۔ جب یہ کہا کہ کسی انسان کو، کسی دوسرے انسان پر حقِ حکومت حاصل نہیں، تو اس کی وجہ یہ بتائی کہ:۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)۔ ''ہم نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے''۔ اور تکریم وشرفِ انسانیت کا تقاضا ہے کہ کوئی انسان، کسی دوسرے انسان کا محکوم ومحتاج نہ ہو۔ بالفاظِ دیگر، قرآن کے نزدیک، انسانوں کی حکومت، شرف وتکریمِ انسانیت کے منافی ہے۔ ہمارے دور کا علم النفس کا ممتاز ماہر (Erich Fromm) کہتا ہے کہ:۔ ''ایسی سیاسی آزادی جس میں انسان کو سطحِ انسانیت سے گرا دیا جائے۔ جس میں اسے (Dehumanise) کر دیا جائے، آزادی نہیں رہتی، غلامی بن جاتی ہے''۔۔ شرف وتکریمِ انسانیت یا احترامِ آدمیت تو خدا کا عطا کردہ ہے۔ قرآن کی رو سے مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ، نہ صرف اس شرف وتکریم کی حفاظت کرے، بلکہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں شرف وتکریم کی صلاحیتیں نشوونما پاتی اور بڑھتی، پھولتی، پھلتی چلی جائیں۔۔ یہ وجہ ہے جو قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفت، جس سے اس کتابِ عظیم کا آغاز ہوتا ہے، ربوبیتِ عالمینی قرار دی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (1:1)۔ ظاہر ہے کہ وہی نظام منشائے خداوندی کو پورا کرنے والا ہوگا جو خدا کی اس صفت کا مظہر ہو۔''

بنیادی اصول:۔

اسلامی مملکت کا بنیادی اصول ''تکریمِ انسانیت'' ہے۔ جس اسلامی مملکت میں کسی ایک بھی انسان کی کسی بھی طرح

تذلیل ہوگی، خواہ وہ انسان کسی بھی ذات، رنگ، نسل، علاقہ یا مذہب سے تعلق کیوں نہ رکھتا ہو، وہ مملکت اس وقت تک اسلامی کہلانے کی مستحق نہیں ہوگی جب تک وہ اس انسان کو (قرآن کے قوانین کے مطابق) حقیقی معانی میں انصاف مہیا کر کے مطمئن نہیں کر دے گی۔ تکریم کا معیار صرف اور صرف ''انسان'' ہوگا۔ نہ کہ کوئی اور چیز۔ پرویز صاحب کے مطابق قرآن کریم ''انسان کی ہر نوعِ غلامی سے رستگاری'' کی ابتداء اس سے کرتا ہے کہ:۔ ''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، محض انسان ہونے کی حیثیت سے، یکساں طور پر واجب التکریم ہے۔ اس میں رنگ، نسل، زبان، ملک، قوم، حسب، نسب، امارت، افلاس وغیرہ کی کوئی تمیز نہیں۔ ہر انسان بحیثیت انسان، یکساں عزت کا مستحق اور تعظیم کا سزاوار ہے۔ عملاً اس اصول کے معنی یہ ہیں کہ، اسلامی مملکت نہ کوئی ایسا قانون بنا سکتی ہے اور نہ معاشرہ میں ایسا نظریہ رائج ہونے دے سکتی ہے جس کی رو سے کوئی انسان (پیدائشی یا پیشہ کی) اضافی نسبتوں سے شریف یا ذلیل تصور کیا جائے۔ معاشرہ میں عزت کے مدارج، جوہر ذاتی کے مطابق متعین ہوں گے۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (46:19)۔ تمام انسانوں کو پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب العزت سمجھنا، ہر ایک کو اس کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے یکساں مواقع مہیا کرنا اور سعی و عمل کے لحاظ سے ان کے مقامات و مدارج کا تعین کرنا، اس نظامِ خداوندی کا ثمر اولیں ہے۔ اس سے ذات، گوت، برادری کے تمام امتیازی نشانات ختم ہو جاتے ہیں، اور وراثتی مناصب و اقتدار حرفِ غلط کی طرح محو ہو جاتے ہیں۔ ہر انسانی بچہ سادہ لوح لے کر پیدا ہوتا ہے اور سب کے لئے سعی و عمل کے میدان یکساں کھلے ہوتے ہیں۔'' (طلوعِ اسلام جون 1977ء صفحہ نمبر 17)۔

احترامِ آدمیت۔ حدالحدود:

حدود اللہ پر گفتگو کرتے ہوئے پرویز صاحب کہتے ہیں:۔ ''اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے، یہ سوال بار بار مرکوزِ توجہ رہا کہ اس سلسلہء زریں کا آغاز کس کڑی سے کیا جائے کہ ان میں سے ہر کڑی اپنی اپنی جگہ یکساں اہمیت کی حامل ہے۔ کافی غور و فکر کے بعد، فٹ بال کے کھیل کے میدان کی مثال سے ایک حقیقت زیادہ نمایاں طور پر میرے سامنے آ گئی۔ اور وہ یہ کہ میدان کے چاروں طرف ایک حد ہوتی ہے جسے (Boundary line) کہا جاتا ہے۔ اہمیت کے لحاظ سے تو ہر حد یکساں ہوتی ہے لیکن باقی حدود، اس حدالحدود کے اندر ہوتی ہیں۔ چنانچہ میں اس سلسلہ کا آغاز، اسی حدالحدود سے کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ (میری بصیرت کے مطابق) قرآن کی رو سے بھی اس حد کی یہی پوزیشن سمجھ میں آتی ہے۔ اور وہ حدالحدود ہے، احترامِ آدمیت، تکریمِ انسانیت۔ آپ بنظرِ تعمق دیکھیں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآنی تعلیم کا مطلوب و مقصود، یہی حد ہے۔ باقی حدود، اسی حد پر متفرع ہیں، اور اسے محفوظ رکھنے کا ذریعہ۔ علامہ اقبال نے جب کہا تھا:۔

برتر از گردوں مقامِ آدم است اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

تو ''اصل تہذیب'' سے ان کا بھی یہی مطلب تھا۔ قرآن کریم نے اس حد کو ان چار لفظوں میں بیان کر دیا ہے جب کہا کہ:۔ (17:70)۔ ہم نے ہر انسان، ہر ابنِ آدم، کو محض انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم بنایا ہے۔ آپ ان چار لفظوں کے اندر مستور حقائق کو کھولتے جایئے اور دیکھئے کہ یہ کس طرح ہر چہار اطرافِ عالم کو محیط ہوتے چلے جاتے اور ساری فضائے کائنات کو اپنے آغوش میں لے لیتے ہیں۔'' (طلوعِ اسلام جون 1978ء صفحہ نمبر 28)۔

مجرم کو بھی بنظرِ حقارت نہ دیکھو:

طلوعِ اسلام فروری 1974ء۔ص۔22:۔ ''قرآن اس باب میں اس حد تک آگے جاتا ہے کہ وہ مجرم کو اس کے جرم کی سزا تو دیتا ہے لیکن اس کی تذلیل و تحقیر نہیں کرتا۔ جو عزت اسے بحیثیت انسان حاصل تھی، اُس سے وہ نہیں چھینتا۔ آپ دیکھئے کہ خدا مجرمین کو کس پیار سے بلاتا ہے جب کہتا ہے کہ: قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ (39:53)۔ اے میرے بندو! جو اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھے ہو، میری رحمت سے ناامید مت ہو۔ وہ (خدا) جہنم میں جانے والوں کے متعلق بھی ایک مشفق و جانسوز ہمدرد کی طرح ''بصد حسرت و تاسف'' کہتا ہے کہ: يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ (36:30)۔ وائے، اے میرے بندو! (تم نے اپنے آپ سے یہ کر دیا)۔ وہ مجرموں کو بھی ''میرے بندے'' کہہ کر پکارتا ہے کہ ارتکابِ جرم کی غلطی اور لغزش سے، ان کی انسانیت ان سے نہیں چھن گئی۔ لہٰذا، انسان ہونے کی حیثیت سے وہ جس عزت و توقیر کے مستحق تھے، ان کی وہ حیثیت بہر حال و بہر حیث قائم اور دائم رہتی ہے۔''

عوام اور خواص کی تفریق:

طلوعِ اسلام اپریل 1974ء۔ص۔17:۔ ''آج یہ آواز دنیا کے ہر حصے سے اٹھ رہی ہے کہ:۔ تمیز بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے۔ طبقاتی تفریق و تقسیم، وجہء فسادِ عالم ہے۔ اسے مٹا دینا چاہیئے۔ لیکن یہ آواز زمانے کے تقاضوں سے ابھری ہے۔ اس نے ابھی شمعِ مصطفوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اکتسابِ ضیا نہیں کیا۔ یہ ''ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است۔'' ندائے مصطفوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے طبقاتی تفریق و تقسیم کے مٹانے کا اصول کچھ اور بتایا تھا۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ انسان نے اپنے عقلی طریقِ کار کی رو سے، اتنا تو سمجھ لیا ہے کہ طبقاتی تقسیم تباہی کا موجب ہے، لیکن ابھی وہ اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکا کہ اس کے مٹانے کا طریق اور اصول کیا ہے۔ طبقاتی تفریق کو مٹانے کی آواز سب سے زیادہ گھن گرج کے ساتھ سوشلسٹ ملکوں سے اٹھی۔ لیکن وہاں جا کر دیکھئے کہ کیا یہ تفریق واقعی مٹ چکی یا مٹ رہی ہے؟۔ وہاں یہ تفریق اُسی طرح باقی ہے۔ وہاں ابھی تک ورکر، ورکر ہی ہے۔ ہمارے ہاں مساوات کے سلسلہ میں، عوام کا لفظ، دن میں سو سو بار دہرایا جاتا ہے۔ کیا اس سے یہ تفریق مٹ گئی ہے؟۔ مٹ جانا تو ایک طرف، اس سے تو اس تفریق پر اور بھی شدت سے مُہرِ تصدیق ثبت ہو رہی ہے۔ یہ

حقیقت بدیہی ہے کہ ہر لفظ کا مفہوم اس کی ضد سے متعین ہوتا ہے۔ روشنی کا کوئی مفہوم سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک تاریکی کا تصور سامنے نہ آئے۔ یعنی جب ہم روشنی کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے تاریکی کا وجود ثابت ہوجاتا ہے۔ جب ہم ''غرباء کا طبقہ'' کہتے ہیں تو اس کا لازمی مفہوم یہ ہوتا ہے کہ یہاں ایسا طبقہ بھی ہے جو ''غرباء'' کا نہیں، ''امراء'' کا ہے۔ اسی طرح جب ہم ''عوام'' کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ یہاں ''خواص'' بھی ہیں۔ لہٰذا، عوام کے لفظ میں، ''خواص اور عوام کی تفریق'' کا تصور موجود ہے۔ میں نے یہ دو ایک مثالیں محض سمجھانے کی خاطر دی ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ابھی صرف طبقاتی تقسیم کے جہنم کا احساس بیدار ہوا ہے، اس جہنم سے نکلنے کا راستہ سامنے نہیں آیا۔ یہ راستہ اسے دینِ خداوندی سے ملے گا۔ جس نے اعلان کیا کہ: ولقد کرمنا بنی آدم (17:70)۔

طبقاتی تقسیم:

یاد رکھو! تمام انسان، محض انسان ہونے کی جہت سے، یکساں واجب التکریم ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ: وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (46:19)۔ معاشرہ میں مدارج کا تعین افرادِ معاشرہ کے حسنِ عمل کی رو سے ہوگا، نہ کہ حسب ونسب یا مال ودولت کی نسبت سے۔۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ معاشرہ میں مختلف کام مختلف لوگوں کے سپرد رہیں گے (43:32)۔ لیکن یہ باہمی تعاون کی شکل میں ہوگا۔ اس سے تکریم وتعظیم یا اونچ نیچ کا تعین نہیں ہوگا۔۔ تکریم کا معیار ایک ہی ہوگا۔ اور وہ یہ کہ: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (49:13)۔ تم میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہوگا جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کا پابند ہوگا۔ اس طرح وہ طبقات جن کا مدار پیدائشی تفریق پر ہے (جیسے ہندوؤں کے ورن، یا نسلی امتیاز، یا ذات برادری کا فرق جو نسلی امتیاز ہی کی دوسری شکل ہے) یا معاشی اختلاف پر۔ سب ختم ہوجائیں گے۔۔۔ اور عزت وتکریم کا معیار حُسنِ سیرت (اخلاقی پاکیزگی) ہوگا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے ''دین'' کے اسی اصول کے مطابق ایک امت متشکل فرمائی، جس میں طبقاتی تفریق کا تصور تک نہ تھا۔ اس میں بندہ اور آقا، آجر اور مستاجر، مزدور اور مالک، محنت کش اور سرمایہ دار، حتیٰ کہ حاکم و محکوم تک کی بھی کوئی تمیز وتخصیص نہ تھی۔۔ اس میں باہمی تعاون کی رو سے، معاشرہ کے تمام کام بطریقِ احسن سرانجام پاتے تھے۔ لیکن کام یا پیشہ کی نسبتوں سے اعلیٰ وادنیٰ کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ اس میں امت کے تمام افراد مومن یا مسلم کہہ کر پکارے جاتے تھے اور خود ذاتِ رسالتمآب ﷺ کا بھی اعلان تھا کہ: انا اول المسلمین۔ میں سب سے پہلا مسلم ہوں۔ اس میں عوام یا خواص کے الفاظ تک نہ تھے۔

''عوام'' کا لفظ، ذلت آمیز:

''عوام'' کے تو لفظ تک میں ذلّت کی جھلک موجود ہے۔ اس امت کے افراد کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ۔۔ تیری سرکار

میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔۔تو یہ منظر صحنِ مسجد تک محدود نہیں تھا۔زندگی کے ہر گوشے میں کارفرما تھا۔۔۔بہر حال، جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، انسان اپنے تجربات و مشاہدات کی بناء پر، طبقاتی تقسیم کی تباہ کاریوں کو تو محسوس کرنے لگ گیا ہے۔لیکن ابھی اسے اس جہنم سے نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا۔یہ اُس وقت ہوگا جب اس کے سامنے مساواتِ محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دروازہ کھل گیا۔اُس وقت دینِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ گوشہ بھی، باقی ادیان پر غالب آجائے گا۔''

حاکم ومحکوم کا تفاوت:

طلوعِ اسلام فروری 1974ء۔ص۔23:۔''انسان اور انسان کا سنگین ترین تفاوت، حاکم ومحکوم کی تفریق کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت، اختیار وارادہ ہے۔اور حاکم ومحکوم کی تفریق کا میدان وہ ہے جہاں ایک فرد کا اختیار وارادہ دوسرے فرد کے اختیار وارادہ سے ٹکراتا ہے۔انسانی فکر نے بڑی کوشش کی ہے کہ حاکم ومحکوم کی تفریق مٹادی جائے، لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا۔اس کی اس کوشش کی آخری کڑی جمہوری نظام ہے۔لیکن جیسا کہ اب جمہوری نظام کے مدعیوں کو خود اعتراف ہے، اس نظام سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکا۔یہ تفریق بدستور باقی ہے۔فرانسیسی مفکر، وینی گوئن کے الفاظ میں:۔''اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ اس میں لوگ اپنی حکومت آپ قائم کرتے ہیں، تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی تھی، اور نہ آج کہیں موجود ہے۔اس میں جو لوگ برسرِ اقتدار آجاتے ہیں، ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دل میں یہ عقیدہ قائم کردیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں۔وہ اپنے حاکم آپ ہیں۔یعنی حکومت عوام کی ہے۔''(The crisis of modern world-p/106)۔لہٰذا، حاکم ومحکوم ایک سطح پر نہ پہلے کبھی آئے تھے، نہ اب آسکے ہیں۔برسرِ اقتدار طبقہ نے اپنے آپ کو ہمیشہ بلند وبالا سمجھا اور محکوموں کو بنظرِ حقارت دیکھا ہے۔جب حضرت موسیٰ، اور حضرت ہارون، خدا کا پیغام لے کر فرعون کے پاس گئے ہیں تو اس نے یہ کہہ کر ان کی بات سننے سے انکار کردیا کہ:وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ(23:47)۔یہ ہماری محکوم قوم کے افراد ہیں اس لئے ان کی بات سننے کے قابل کیسے ہوسکتی ہے؟۔جو بات تین چار ہزار سال پہلے فرعون نے کہی تھی، اس کی صدائے بازگشت آج بھی ہر ایوانِ حکومت سے برابر سنائی دیتی ہے، خواہ اس کے الفاظ کتنے ہی بدلے ہوئے کیوں نہ ہوں۔یہی وہ احساس تھا جس سے جھلا کر مارکس نے کہا تھا کہ جب تک دنیا میں حکومت کا ادارہ باقی ہے، انسانی طبقات کی تفریق ختم نہیں ہوسکتی۔بات تو اس نے ٹھیک سمجھی تھی لیکن نہ وہ بتاسکا نہ اس کے متبعین کہ اس تصور کو عمل میں لانے کی صورت کیا ہوسکتی ہے!۔یہ صورت آج سے چودہ سو سال پہلے قرآن نے بتائی تھی۔اس نے کہا کہ حکومت کے ادارہ کا وجود تو بہر حال باقی رہے گا کیونکہ اس کے بغیر انسانی معاشرہ میں انارکی پھیل جائے گی، لیکن اس میں حاکم ومحکوم کی تفریق باقی نہیں رہے گی۔اس

تفریق کو مٹانے کے لئے اس نے اعلان کیا کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79)۔ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے ضابطہء قوانین، نظامِ حکومت، یا نبوت تک بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ۔ اس سے اس نے حاکم ومحکوم کا تصور ختم کر دیا۔ اس کے بعد سوال پیدا ہوا کہ پھر نظامِ حکومت کی صورت کیا ہوگی؟۔ اس کے لئے اس نے کہا کہ اس نظام کا فریضہ صرف ان حدود کی پابندی کرانا ہوگا، جو (کسی انسان کی نہیں بلکہ) خدا کی متعین کردہ اور غیر متبدل ہیں۔ چنانچہ اس آیت کا اگلا حصہ یہ ہے کہ: وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3:79)۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم اس کتاب کی رو سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہو، ربانی بن جاؤ۔ اسی کا نام حکومتِ خداوندی ہے۔ اس مقام پر قرآن ایک ایسا لطیف اور عمیق نکتہ سامنے لاتا ہے کہ جوں جوں نگہء بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آجاتا ہے۔ اس نے، اس نظامِ حکومت کے مرکزِ اوّل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کو لازمی قرار دیا ہے۔ اسی سے، مطاع اور مطیع، یعنی حاکم ومحکوم، غلام اور آقا کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔

شاگرد اور استاد کا رشتہ:

لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے بتایا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت ایک معلم (استاد) کی تھی۔: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (62:2) یعنی اس نظام میں، مطاع اور مطیع کا رشتہ، حاکم ومحکوم یا غلام اور آقا کا نہیں، بلکہ استاد اور شاگرد کا ہوگا۔ ان ہر دو نوعیتوں کے رشتہ کا فرق، اس مشکل ترین مسئلہ کو نہایت آسانی سے حل کر دیتا ہے۔ اتھارٹی، حاکم ومحکوم اور استاد اور شاگرد، دونوں رشتوں میں ہوتی ہے۔ احکام اور ان کی اطاعت بھی ان دونوں میں ہوتی ہے۔ لیکن دونوں کے مقصد ومنتہیٰ میں زمین، آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ حاکم یا آقا کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے غلام، ملازم یا محکوم کا زیادہ سے زیادہ استحصال (Exploitation) کرے۔ وہ اسے اپنے مقاصد کے بروئے کار لانے کا ذریعہ سمجھتا ہے اور اس سے اپنے احکام کی اطاعت اس لئے کراتا ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ حاصل اور وصول کرے۔ محکوم یا غلام ان احکام کی اطاعت مجبوراً کرتا ہے اور ہر وقت اس کوشش میں رہتا ہے کہ اپنے آقا سے جان چھڑا کر بھاگ جائے۔ اس کے برعکس، استاد کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے علم کا زیادہ سے زیادہ حصہ، شاگرد کو دیتا جائے۔ اپنی قابلیت کو زیادہ سے زیادہ شاگرد کے سینے میں انڈیلتا جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ قابل ہو جائے۔ وہ شاگرد کی کامیابی میں اپنی کامیابی اور اس کی ناکامی میں اپنی ناکامی دیکھتا ہے۔ وہ شاگرد سے اپنے احکام وہدایات کی اطاعت اس لئے کراتا ہے کہ اس طرح اس کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے۔ چنانچہ قرآن کریم نے: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ۔ بتائی ہے (62:2)۔ یعنی

وہ، تعلیم کتاب وحکمت سے ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کردے۔ یہ ہے حاکم ومحکوم کے تعلق کی مثال، قرآنی نظامِ حکومت میں۔ یعنی شاگرد اور استاد کا تعلق۔ نہ کہ آقا اور غلام کا رشتہ۔ اتھارٹی کا تصور دونوں میں ہوتا ہے، لیکن اس کی غایت ایک دوسرے سے یکسر مختلف بلکہ متضاد ہوتی ہے۔ اس طرح قرآن، نظامِ حکومت کو باقی رکھتے ہوئے، حاکم ومحکوم کی تفریق مٹا دیتا ہے۔ وہ ان دونوں کے تعلق کی نوعیت بدل دیتا ہے۔''

حاکم ومحکوم کا امتیاز:

طلوعِ اسلام فروری 1974ء۔ص۔14:۔''قرآنی مملکت میں حاکم اور محکوم کا تصور نہیں ہوتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ اس مملکت کا بنیادی فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ قرآن کریم نے یہ فریضہ اُمت کے کسی خاص گروہ کا قرار نہیں دیا۔ بلکہ ساری کی ساری امت کا قرار دیا ہے۔۔۔اس نے کہا ہے کہ: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3:110)۔تم وہ بہترین امت ہو جسے ہم نے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے متشکل کیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے، تقسیمِ عمل کے اصول کے مطابق مختلف کام مختلف افراد کے سپرد کردیئے جاتے ہیں۔ گویا یہ ایک ٹیم ہوتی ہے جو باہمی تعاون سے زندگی کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جاتی ہے۔ اس میں افسر اور ماتحت یا حاکم اور محکوم کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔''الدین''، یعنی قرآنی نظام کی خصوصیتِ کبریٰ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں:۔لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ۖ وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ (82:19)۔کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر نہ کسی قسم کا کوئی کنٹرول یا حقِ حکومت رکھے، نہ کوئی کسی دوسرے کا محتاج ہو۔۔۔اس میں تمام معاملات قوانینِ خداوندی کے مطابق طے پاتے چلے جائیں۔ اس میں کسی کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ دوسرے سے کہے کہ: كُونُوا عِبَادًا لِّي (3:79)۔تم میرے محکوم ہوجاؤ۔ قرآن کریم کے الفاظ میں یہ اختیار، اورتو اور، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی حاصل نہیں تھا۔ سورہء آلِ عمران کی آیت نمبر 78 اس پر شاہد ہے۔''

نہ حاکم نہ محکوم:

طلوعِ اسلام مارچ 1979ء۔ص۔30:۔''اس (مملکت) میں نہ کوئی حاکم ہوگا، نہ محکوم۔ انسانی نظامِ مملکت میں (خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو) یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ جب حکومت قائم ہوگی تو یہ کیسے ممکن ہوگا کہ اس میں نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم۔ حاکم اور محکوم کے بغیر تو حکومت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا!۔لیکن انسانی نظام اور خدائی نظام میں یہ بنیادی فرق ہے۔ نظامِ خداوندی میں، اطاعت نہ کسی فرد کی ہوتی ہے نہ افراد کے کسی گروہ کی۔ اس میں اطاعت قوانین کی ہوتی ہے۔ اور قوانین ایسے جو انسانوں کے وضع کردہ نہ ہوں۔ ان قوانین کا اطلاق، مملکت کے تمام افراد پر یکساں ہوگا۔ اور جسے ہم حکومت

کہتے ہیں اس کا فریضہ ان قوانین کو نافذ کرنا ہوگا۔

جبر نہیں:

ان قوانین کی اطاعت میں بھی کسی قسم کا جبر نہیں ہوگا۔ اسے تمام انسانوں کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ جو ان کی فرمانروائی کو بطیبِ خاطر قبول کرلیں، ان پر ان کا اطلاق ہوگا۔ انہی کو امتِ مسلمہ یا جماعتِ مومنین کہا جائے گا۔ ان قوانین کی دوسری خصوصیت یہ ہوگی کہ ان میں کوئی تغیر وتبدل یا حک واضافہ نہیں ہو سکے گا۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ اس نظام میں نہ صرف یہ کہ کوئی حاکم یا محکوم نہیں ہوگا بلکہ افرادِ معاشرہ کو اس کا کلی اطمینان ہوگا کہ جن قوانین کی اطاعت انہوں نے بطیبِ خاطر اختیار کی ہے ان میں کبھی ردوبدل نہیں ہوگا۔'' اسلامی مملکت میں فرمانروائی قانون یعنی کتاب اللہ کی ہوگی۔ اس طرح قرآن نے انسان کو، انسان کی محکومیت سے نجات دلا دی۔

روٹی کا مسئلہ:

طلوعِ اسلام فروری 1974ء۔ص۔25:۔ ''سائل ومحروم'' کی بات آ گئی تو اس سے وہ چٹان سامنے آ گئی جس سے ٹکرا کر، احترامِ آدمیت کی کشتی پاش پاش ہوجاتی ہے۔ یعنی روٹی کا مسئلہ۔ اس میدان میں اگر حدود اللہ کو مٹا دیا جائے، تو اس سے جس قسم کی تذلیلِ انسانیت ظہور میں آتی ہے اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ یہ بھوک ہے جس سے اس قدر مہیب و عظیم قوتوں کے مالک، شیر کو، سرکس کا رنگ ماسٹر، بندر کی طرح نچاتا ہے۔ وہ تو اسے نچاتا ہی ہے لیکن انسانوں کا بالا دست طبقہ، حدود اللہ سے سرکشی برت کر، رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے کر، جو کچھ، زیردست محتاج انسانوں سے کراتا ہے، وہ کسی حیوان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ اس میدان میں بھی قرآن کریم، احترامِ آدمیت کے تحفظ کے لئے وہی حد بندی کرتا ہے جو اس نے حاکم ومحکوم کی تفریق مٹانے کے سلسلہ میں کی تھی۔ یعنی اس نے جس طرح انسانوں کے ہاتھ سے حقِ حکومت چھین کر، اسے خدا کے ہاتھ میں دے دیا، اسی طرح اس نے رزق کے سرچشموں کو بھی یہ کہہ کر انسانوں کے حیطہء اقتدار سے چھین لیا کہ: نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۚ (6:151)۔ تمہیں اور تمہاری اولاد کو رزق ہماری طرف سے ملے گا۔۔۔ اس ایک حد بندی نے اس سب سے بڑے حربہ کو مسدود ہی نہیں، معدوم کر دیا، جس سے بالا دست انسان، زیردستوں کو محتاج ومحکوم بناتے اور ذلیل و خوار کرتے تھے۔ فرعون کی فرعونیت اس دعویٰ پر تھی کہ: أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (79:24)۔ ہم تمہارے ''ان داتا'' ہیں۔

فرعون، ان داتا:

اور اس کا ثبوت یہ کہ: أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهَٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِن تَحْتِي ۚ (43:51)۔ اس ملک میں اقتدار میرا

ہے۔اس کی زمین میری ملکیت ہے۔اس میں بہنے والی نہریں میرے قبضے میں ہیں۔رزق کے ان سرچشموں پر میرا کلی اختیار واقتدار ہے،اس لئے تم سب میرے محتاج اور محکوم ہو۔فرعون،عزیزانِ من! کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں۔۔اقتدار واختیار جب بھی انسانوں کے ہاتھ میں آئے گا،وہ رزق کے سرچشموں کو اپنے قبضہ میں لے لیں گے۔اور اس طرح،ان میں سے ہر ایک فرعون بن جائے گا۔میں قرآن کے معاشی نظام کے متعلق اس قدر کثرت اور شرح وبسط سے لکھ چکا ہوں کہ اس مقام پر اس کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں سمجھتا۔بنیاد اس سارے نظام کی، یا یوں کہئے کہ مقصود ومنتہیٰ اس نظام کا یہ ہے کہ رزق کی احتیاج سے کسی انسان کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہ لگنے پائے۔نظامِ حکومت کا فریضہ،خدا کے عطا کردہ رزق کی اس طرح تقسیم ہو کہ کسی فرد کی ضرورت رکنے نہ پائے۔۔اور اس کے حصولِ رزق کا یہ حق،کسی شرط سے مشروط نہ ہو،بلکہ رزق کی تقسیم کرنے والے ان سے برملا کہیں کہ:لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا(76:9)۔

عزّتِ نفس محفوظ:

اس کا تم سے معاوضہ یا بدلہ تو ایک طرف،ہم اس کے لئے تمہاری طرف سے کسی شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔بدلہ یا شکریہ کا سوال اس صورت میں پیدا ہو جب ہم نے تمہیں اپنی طرف سے کچھ دیا ہو۔یہ رزق،تمہارے رازق کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ہم تو اس کے صرف قاسم (تقسیم کرنے والے) ہیں،اسی طرح،جیسے پوسٹ مین،منی آرڈر کا روپیہ تقسیم کر دیتا ہے۔۔لیکن قرآن کریم عطائے رزق کے سلسلہ میں جو لم اور غایت بتاتا ہے،اس کی وضاحت کے لئے تقسیم کی یہ تشبیہ بھی ناقص رہ جاتی ہے۔جس طرح اس نے نظامِ حکومت کے ضمن میں،حاکم اور محکوم کا رشتہ،استاد اور شاگرد کا سا بتایا تھا،اسی طرح وہ نظامِ رزق میں بھی رازق ومرزوق کا ایسا رشتہ بتاتا ہے جس میں صلہ اور شکریہ کا احساس تک پیدا نہیں ہوسکتا۔اس نے اسبابِ رزق (بارش وغیرہ) کو خدا کی رحمت کہہ کر پکارا ہے (7:57۔وغیرہ) اور ربوبیتِ عالمین کو اس کی صفتِ رحمانیت ورحیمیت کی مظہر۔الحمدللہ رب العالمین ۔ کے بعد۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (1:1) کے الفاظ،اسی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔رحمٰن یا رحمٰن ورحیم کا مادہ (ر۔ح۔م) ہے جس کے اولین معانی ''رحمِ مادر'' کے ہیں۔اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رو سے،رزق دینے والے اور رزق لینے والے کا باہمی رشتہ ماں اور بچے کا ہے۔آپ غور کیجئے کہ اس رشتہ سے مفہوم ومقصود کیا ہے!۔ (جاری ہے)

سانحہ ارتحال

گذشتہ ماہ محترم خواجہ ازہر عباس صاحب فاضل درسِ نظامی کی اہلیہ محترمہ انتقال فرما گئیں۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ادارہ محترم خواجہ صاحب اور ان کے فرزندِ ارجمند کے دُکھ میں برابر کا شریک ہے۔

بزمِ طلوع اسلام فیصل آباد کے جوان سال رُکن اسد اللہ غالب ناگہانی طور پر جان بحق ہو گئے۔دعا ہے کہ اللہ اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ادارہ مرحوم کے اعزہ واقرباء کے غم میں برابر کا شریک ہے

ڈاکٹر اعجاز رسول
erasool@aol.com

قرآن کی روشنی میں آخرت کی زندگی

پرویز صاحب کی کتاب جہانِ فردا سے ماخوذ

موت انسانی زندگی کا ایک بہت اہم واقعہ ہے جس سے انسانی جسم کو ہر صورت دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ انسان کے اندر کی خواہش اُس کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ وہ موت کو جتنی دیر تک Delay کر دے اتنا ہی بہتر ہے۔ دوسروں کی موت کو ہم محسوس بھی کرتے ہیں اور اُن کے جانے کے بعد کے حالات کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اپنی موت ایسا Event ہے جس کے آنے کے بعد ہمیں کچھ علم نہیں ہوتا کہ اس کے بعد کیا ہوا ہے۔

موت کے متعلق قرآن نے بھی بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ چونکہ یہ سب انسانوں کو آتی ہے اور انسانی ذہن میں جتنے بھی سوالات اس کے متعلق اٹھتے ہیں قرآن نے اُن کے متعلق تفصیل بیان کی ہے اور اُس کو انسانی عقل اور Reason کے استعمال کے ذریعہ سمجھنے کے لیے کہا ہے۔ قرآن چونکہ انسان کو اپنی عقل اور Reason کے استعمال کی بار بار تاکید کرتا ہے اس لیے کہ یہی وہ مقام ہے جس سے انسان اپنی زندگی کے مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ انسانی جسم تو صرف ایک Tool ہے جو کہ انسانی سوچوں کے مطابق کام کرتا ہے۔

اس موضوع میں ہم سب سے پہلے مکافاتِ عمل (The Law of Requital) کو لیتے ہیں۔

مکافاتِ عمل کا قانون:

انسان کے ہر عمل کا نتیجہ پیدا ہو کر رہتا ہے۔ قرآن کے مطابق ہر کام کا ایک متعین نتیجہ ہے۔ یہ قانون ہر وقت انسانی زندگی میں سرگرمِ عمل ہے اور اس میں تبدیلی ناممکن ہے۔ یہ اللہ کا قانون ہے اور پوری انسانی زندگی اور اُن کے اردگرد کی طبیعی زندگی بھی Law of Cause and Effect میں جکڑی ہوئی ہے اس لیے اُس کے لیے ضروری ہے کہ اس قانون کو اچھی طرح سمجھ لے اور پھر اس پر ایمان لے آئے اگر اُس نے اپنی زندگی سے پورا فائدہ اٹھانا ہے۔

اس قانون کے کام کرنے کے سلسلہ میں یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ ہر انسانی عمل اور سوچ کا اثر اُس کی ذات پر ہوتا ہے۔ ہم کسی بھی کام کو نہیں کر سکتے جب تک اُس کے متعلق پہلے سوچ نہیں رکھتے۔ یعنی ہماری Thinking ہر عمل سے پہلے آتی ہے چاہے یہ سوچ کتنی ہی Short کیوں نہ ہو۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری سوچ ہمارا خاموش عمل ہے جبکہ ہمارا طبیعی

عمل ہمارا Visible Act ہے۔ اس سلسلہ میں ہم نے دیکھا ہوگا کہ کافی سارے فیصلے ہمارے دماغ کے اندر رہتے ہیں اور ہم بہت دیر بعد اُن پر عمل کرتے ہیں جبکہ بہت سے دوسرے فیصلوں پر ہم کبھی بھی عمل پذیر نہیں ہوتے۔ قانونِ مکافاتِ عمل کے طریقہ کار کے سلسلہ میں چند اور نکات کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔

1۔ اس دنیا میں ہر جگہ انسانی قوانین کارفرما ہیں جو کہ زیادہ تر انسانی Circumstantial شہادت پر منحصر ہیں۔ بہت سے مقدموں میں مجرم سزا سے بچ بھی جاتا ہے اور بعض اوقات بے گناہ کو بھی سزا مل سکتی ہے۔ ان سب کا انحصار اس شہادت پر ہے جو کہ انسانی نظام، عدلیہ اپنی کوشش سے مہیا کرتی ہے۔

2۔ قرآنی نظام کے تحت چونکہ ہماری سوچ اور عمل دونوں ہماری ذات پر اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے یہ نظام عدل کی بہترین شکل ہے اور ہم میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو ان اثرات سے نہیں بچا سکتا۔ اچھی سوچ اور اچھے عمل کا مثبت نتیجہ ہوگا اور غلط سوچ اور غلط اعمال کا غلط اثر۔

3۔ ہر سوچ اور عمل کا ایک Scale ہے۔ جتنا بڑا اور اہم عمل ہوگا اُس کی نسبت سے اُس کا اثر بھی اتنا ہی بڑا ہوگا۔ اس سے ہم اپنی ذات کے متعلق اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیا یہ اس قابل ہوگئی ہے کہ موت سے آگے کے مرحلہ میں مزید مراحل طے کرے گی۔ قرآن نے اس سلسلہ میں اس کے لیے Criteria بیان کر دیا ہے۔ مثلاً (40:40) اور (28:84)، مکافاتِ عمل کے قانون کے مطابق اگر ایمان لانے کے بعد مثبت اعمال کا پلڑا بھاری ہوگا تو یہ زندگی جنت کی ہوگی اور اگر یہ پلڑا منفی اعمال کی وجہ سے بھاری ہوگا تو اس کو جہنم کی زندگی کہا جائے گا۔

4۔ بنیادی لیول پر ہر انسان ایک مکمل یونٹ ہے۔ اس کو ہم خود آسانی سے ٹیسٹ کر سکتے ہیں۔ مثلاً میری تکلیف میری ہے کوئی دوسرا اسے کم نہیں کر سکتا۔ میری ذہنی اذیت یا خوشی میری ہے کوئی دوسرا کبھی بھی اُس طرح محسوس نہیں کر سکتا جس طرح میں کرتا ہوں اس لیے کسی بھی معاشرہ میں رہتے ہوئے انفرادیت اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے اور چونکہ معاشرہ طبیعی طور پر افراد پر مشتمل ہوتا ہے تو افراد غلط نظام کی بدولت اپنی انفرادیت کو عارضی طور پر کھو سکتے ہیں۔ پھر غیر قرآنی معاشرہ میں چونکہ سارا زور معاشیات پر ہوتا ہے اس لیے اکثریت کی سوچ کا مرکز اپنی مادی ضروریات کا حصول ہی ہوتا ہے۔ یہ مادی ضروریات ہی معاشرہ میں کامیابی کا معیار بن جاتی ہیں۔

5۔ چونکہ انسانی جسم بھی مادی پیکر ہے اس لیے انسان کے لیے مشکل ہے کہ وہ اس کی ضروریات اور اثرات سے باہر ہو کر سوچے اور اپنی Thinking پر اپنے دماغ کو Direct کر لے۔ لیکن یہی وہ عمل ہے جس کی طرف قرآن بار بار ہمیں دعوت دیتا ہے۔ کیونکہ اسی کے استعمال سے انسان اپنے اندر کی قوتوں سے آگاہ ہوتا ہے اور اپنے نفس کی Development کا

سوچ سکتا ہے۔ موت کے متعلق جو آیات ہیں اُن میں اسی حقیقت کا ذکر ہے۔ ہر ذی نفس موت کا مزہ چکھے گا (29:57) اس میں نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ کہا گیا ہے کہ ہر نفس موت کا مزہ چکھے گا یعنی جسم کی موت کو نفس سے علیحدہ کر دیا ہے۔ اس طرح نفس ایک علیحدہ ہستی بن کر ابھرتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن نے سورۃ الانفال (8:24) کی آیت میں 'زندگی' کہہ کر ہماری توجہ کو دعوت دی ہے۔

6۔ موت اگر انسانی جسم کے لیے ہے جو کہ طبیعی قانون کے تحت کام کرتا ہے۔ تو نفس کے لیے قرآنی ہدایت کی ضرورت سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہم اس پر اندرونی غور و خوض کر کے اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ وہ سوالات جو ہماری زندگی اور موت کے متعلق ہیں کیا قرآن اُن کے جوابات مہیا کرتا ہے جو کہ انسانی عقل اور ذہانت کو Appeal کرتے ہیں۔ قانونِ مکافاتِ عمل کو مکمل طور پر سمجھے بغیر ہم اس زندگی، اگلی زندگی اور موت کے متعلق مسائل کو سمجھ نہیں سکتے اور یہ سب غیر طبیعی باتیں ہیں جو کہ صرف انسان اپنے عقل و فکر کے ذرائع استعمال کر کے ہی سمجھ سکتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عقل و فکر کی اس زندگی اور اگلی زندگی میں کتنی اہمیت ہے اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ جو یہاں اندھا ہے وہ اگلی دُنیا میں بھی اندھا ہو گا (17:72)۔

7۔ عمل اور اُس کے نتیجہ میں ایک وقفہ ہے۔ لیکن یہ غیر طبیعی اعمال کے لیے ہے کیونکہ مثلاً ہم نے اگر آگ میں اُنگلی ڈالی ہے تو اُس کا نتیجہ فوراً سامنے آجائے گا۔ لیکن اگر کسی اور نے ہماری انگلی زبردستی آگ میں ڈالی ہے تو انگلی کے جلنے تک طبعی قانون لاگو ہو گا لیکن کسی دوسرے کے اعمال کے لیے وقفہ کی ضرورت ہو گی کیونکہ اُس کی نوعیت کے مطابق ردِ عمل کچھ دیر بعد ہو سکتا ہے۔ اس وقفہ کو ہم The Law of Respite کہہ سکتے ہیں۔ اس کے لیے دیکھئے آیت (16:61)۔ اسی وقفہ کی وجہ سے قوموں کو اُن کے اعمال کا نتیجہ بہت دیر بعد ملتا ہے۔ کیونکہ وہ نتیجہ اُس قوم کے افراد کے اعمال پر منحصر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مثلاً پاکستان میں اتنی غلط روش کے باوجود اوپر کے طبقہ پر بہت سخت پکڑ نہیں آئی اور صرف انفرادی طور پر ہی مختلف افراد زیرِ گرفت آرہے ہیں۔ یہی حال باقی اقوام کے لیڈروں کا بھی ہے۔ لیکن اگر یہ روش نہ بدلی گئی تو عنقریب حالات اُس حد تک چلے جائیں گے جہاں سے واپسی ناممکن ہو جائے گی۔

8۔ اس لحاظ سے ہر انسان اپنے اوپر خود محاسب ہے۔ یہ ایسا اہم نقطہ ہے جس کو سمجھے بغیر موت کی سمجھ نہیں آسکتی۔ اس سے پہلے مئی 2015ء کے شمارہ میں قرآن اور انسانی عقل پر ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ جس میں انسانی ذات کے اجزاء اور Tools کے متعلق لکھا گیا ہے۔ اُس مضمون کے پڑھنے سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ہماری سوچیں (Thinking) اس دُنیا میں کس طرح ہماری مدد کرتی ہیں کہ ہم اپنے Self کو Develop کر سکیں۔ قرآن کے مطابق اگر ہم اس کی مستقل اقدار (Permanent Values) کے اندر رہتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں (اور سوچتے ہیں) تو ہم بتدریج ہر روز

تبدیل ہوتے جاتے ہیں اور اس تبدیلی کو ہم محسوس بھی کرتے ہیں اور اپنی سابقہ زندگی کی روشنی میں اس کو Assess بھی کر سکتے ہیں۔ اس میں ایک بہت اہم نقطہ یہ ہے کہ یہ Self-Assessment جو کہ قرآن کو بحیثیت ایک خارجی معیار کے طور پر استعمال کر کے کرنی ہوگی۔ یہ ایک غیر جذباتی judgement ہوگی۔ یعنی قرآنی معیار کے مطابق، قرآن نے خود کہا ہے کہ دیکھو آپ کیا تھے (قرآنی تعلیم سے پہلے) اور اب کیا بن گئے ہو۔ دیکھئے (2:103)۔

9۔ ایک اور اہم نقطہ یہ ہے کہ مکافاتِ عمل کا قانون انفرادی طور پر کام کرتا ہے لیکن چونکہ افراد اس دُنیا میں معاشرہ اور قوموں کو بناتے ہیں اس لیے اس دُنیا کی حد تک قوموں پر بھی اس قانون کا اثر ہوتا ہے۔ وہ افراد جو قرآن کے مطابق ایمان لا کر (2:177) اعمال صالح کرتے ہیں اور ساتھ یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ دوسروں تک قرآن کے پیغام کو پہنچاتے ہیں اُن کی یہ زندگی معاشرہ کے غلط نظام کی وجہ سے شاید بہت مشکل بسر ہو لیکن، انفرادی طور پر وہ اگلی زندگی میں مزید ترقی کے قابل ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے صاف طور پر واضح کر دیا ہے کہ کسی بھی ایمان اور اعمالِ صالح والے مومن کی زندگی کا کام ضائع نہیں ہوگا مثلاً دیکھئے آیات (19:60, 16:97, 10:62-64, 40:28)۔

10۔ قرآن واضح طور پر ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کیا ہے اور اُس کی مشکلات کیا ہیں۔ ساتھ ہی قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ اُسے کیا بننا چاہئے اور اس عمل اور کوشش میں قرآنی فکر اور تعلیم اس کی کیسے مدد کر سکتی ہے۔ وہ ساتھ ہی اپنی ہدایت کے راستہ کو (Sign post) بھی کرتا جاتا ہے تا کہ انسان جو کہ مومن بن گیا ہوتا ہے اپنے راستہ کے سنگ میل (Milestones) کو Recognise کر کے آگے بڑھتا جائے۔ مکافاتِ عمل کا قانون اس سارے سفر میں انسان کو ہر وقت Remind کرواتا رہتا ہے کہ چونکہ ہر عمل (اور سوچ) کا ایک نتیجہ ہے اس سے مومن کا شعورِ خویش آہستہ آہستہ زیادہ Conscious ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ Self Consiousness میں بڑھوتی (Increase) اور زندگی کے مسائل میں قرآنی فکر سے حل کرنے کی تربیت مومن کی اندر کی سوچ میں تبدیلی پیدا کر دیتی ہے۔ اس تبدیلی سے ہی وہ اپنی ذات استحکام پیدا کر لیتا ہے جو کہ قرآنی نظام کو قائم کرنے اور چلانے کے لیے بے حد ضروری ہے۔

11۔ قانون مکافاتِ عمل پر کاربند رہنے سے انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ غیر ضروری سوچ اور اعمال کے اثرات تبدریج اپنی زندگی سے نکال سکتا ہے۔ مثلاً قرآن نے صاف طور پر کہا ہے کہ کسی انسان سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ دوسرے انسانوں نے کیا کیا تھا جس میں ماضی کی Generations بھی آجاتی ہیں۔ (2:134) اس سے انسان کا کافی وقت بچ جاتا ہے اور وہ اپنی ذات اور موجودہ حالات پر اپنی پوری کوشش صرف کرتا ہے۔ اگرچہ قرآن نے تاریخ کے مطالعہ پر اس حد تک زور دیا ہے جہاں تک سبق سیکھنے کا تعلق ہے۔ تا کہ قوموں کے عروج اور زوال کی کہانی سے قرآن پر انسانی ایمان پختہ

ہوجائے۔ انسان اُسی بات پر ایمان لاسکتا ہے جس کے متعلق اُس کو سو فیصد یقین ہو کہ اس سے اُس کا فائدہ ہوگا۔ لوگ غلط خیالات پر بھی ایمان لے آتے ہیں یہ سوچتے ہوئے کہ یہ صحیح ہیں۔ اُن کا ایمان ٹھیک ہوتا ہے لیکن جس میں وہ Believe کرتے ہیں وہ غلط ہوتا ہے۔ مذہب میں اس کی مثالیں موجود ہیں مثلاً قرآن کے پڑھنے سے ثواب ہوتا ہے۔ عیسائیت میں کفارہ کا Belief۔

12۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی قانون کے موثر ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس کو لاگو کرنے کے لیے ایک اتھارٹی یا قوت ہو۔ قانونِ مکافاتِ عمل کے پیچھے اللہ کی ذات ہے۔ جس کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ انسان جہاں بھی ہے اللہ کی ذات اُس کے ساتھ ہے (57:4) اس طرح ایک اور آیت میں ہے کہ کوئی بھی گفتگو ہو اللہ کی ذات وہاں موجود ہوتی ہے (58:7)۔ یہ نظام اتنا سخت اور Precise ہے کہ وہ دِلوں کے حال تک سے واقف ہے (40:19) یہ ایک بہت اہم نقطہ ہے جس کا سمجھنا نہایت اہم ہے۔ چونکہ قانون مکافاتِ عمل کے کام کرنے کے لیے عمل اور اُس کے نتیجہ میں ایک وقفہ رکھا گیا جس کا Scale ہے۔ اس لیے اُس کام کرنے کے لیے اِس طرح کا نظام ہونا چاہئے جس میں کوئی اتھارٹی ہر وقت اس بات کا انتظام کرے کہ ہر عمل کا نتیجہ نکلنا ہے اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ اس کے لیے قرآن نے بہت صاف طریقہ سے Warn کر دیا ہے کہ اس قانون کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا کیونکہ یہ قانون اللہ کا بنایا ہوا ہے جو حی القیوم ہے یعنی زندہ بھی ہے اور قائم بھی تاکہ اپنے قانون کے لاگو ہونے کو دیکھ سکے۔ اسی سلسلہ میں جب حضرت موسیٰؑ فرعون کے پاس جارہے تھے تو قرآن نے نوٹ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰؑ تم جاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم دیکھتے بھی ہیں اور سنتے بھی (20:46)

موت:

اِن تصریحات کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ موت کیا ہے۔

(1) موت انسانی جسم کے ختم ہونے کا نام ہے۔ یعنی جب یہ کام کرنا بند کر دے۔

(2) موت سب انسانوں کو آتی ہے اور اس سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا۔ حتیٰ کے رسول اللہ ﷺ کے متعلق بھی فرمایا کہ آپ کو بھی موت آئے گی۔ (39:31) اس لیے اس قسم کے تمام عقائد قرآن کے مطابق غلط ہیں جن میں موت کے بعد اِس دنیا میں واپسی کا ذِکر ہے۔ یہ اللہ کا قانون ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

(3) موت کے ساتھ انسان کا رابطہ اِس دُنیا کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے۔ اُسے کچھ علم نہیں ہوتا کہ یہاں پر کیا ہو رہا ہے۔ البتہ جب دوبارہ زندگی ملے گی تو انسان کو اپنی زندگی کے واقعات یاد ہوں گے۔ البتہ وقت کا احساس نہیں ہوگا۔

(4) قرآن کے مطابق موت اور دوبارہ زندگی ملنے تک کے عرصہ میں انسان نیند کی حالت میں چلا جاتا ہے اور اُس کا

شعورِ خویش معطل ہو گیا ہوتا ہے۔ اِسے برزخ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(5) موت اور اگلی زندگی کے درمیان کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے اگر انسان نے ایسے اعمال کیے ہوں جو کہ صالح اعمال کے Scale میں بہت بلند ہوں جیسے اللہ کی راہ میں کسی مستقل قدر کے لیے جان دے دینا۔ آیات دیکھئے (3:169) اور (2:154) (مزید تفصیل کے لیے جہانِ فردا کو دیکھئے)

(6) انسانی موت کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہمارے پاس Limited وقت ہے اور یہ وقت ایمان اور صالح اعمال کے سلسلہ میں استعمال کرنا چاہئے کیونکہ اس زندگی کی مدت آنے والی زندگی کی مدت سے انتہائی زیادہ کم ہے۔ اگلی زندگی کا سارا دارومدار ہماری اِس زندگی کی Performance پر ہے۔

(7) ایمان بالآخرت کا مطلب یہ ہے کہ زندگی نے جسمانی موت کے بعد آگے جانا ہے۔ اس لیے ذہنی طور پر اپنے شعور کو اِس حد تک بلند کرنا ہے تاکہ یہ مستقل قدر ہر وقت ذہن میں رہے اور اپنی سوچ اور اعمال کو اِس قدر (Value) کا خیال رکھتے ہوئے کیا جائے۔

(8) مکافاتِ عمل کے قانون کے ساتھ قرآن موت کو بھی ایک Reference کے طور پر استعمال کرتا ہے اور انسان کو بار بار یاد دِلاتا ہے کہ اُس کی یہ طبیعی زندگی محدود ہے اور یہ محدودیت ایک مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مثلاً کہیں اِس دُنیا کی ضروریات زندگی کو متاع سے تعبیر کیا ہے اور کہیں یاددہانی کروائی ہے کہ سب نے اللہ کی طرف رجوع کرنا ہے۔ کہیں کہا کہ اگلی دنیا میں سب کے اعمال نامے سامنے آجائیں گے۔ کہیں دُنیاوی زندگی کے عارضی ہونے کا ذِکر ہے۔ وقت کے گزرنے کا احساس بھی ایک Reference ہے۔

(9) موت ہی کی وجہ سے دو زندگیوں کے متعلق نظریات نے جنم لیا ہے۔ پہلے نظریہ کے مطابق انسانی زندگی طبیعی موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اور جو کچھ انسان نے اس زندگی میں کیا ہے اُس کا مزید نتیجہ نہیں نکل سکتا اور مکافاتِ عمل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ دوسرے نظریۂ حیات کے مطابق انسان کے اندر اُس کی ذات ہے جو کہ موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی اور اگر اُس کو مستقل اقدار کے اندر Develop کیا جائے تو وہ اس قابل ہو سکتی ہے کہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کر سکے۔ اس نظریہ کے مطابق یہ زندگی انتہائی اہم ہے کیونکہ یہاں پر ہی انسان اپنی محنت سے اپنی ذات کو اس قابل بنا سکتا ہے جو کہ اگلی زندگی میں مزید آگے بڑھ سکے گی اور اس زندگی کی انتہا مقرر نہیں ہے۔ اس زندگی کے لیے کام کرنے والے اپنی ذات کو اس دُنیا میں بڑھتے محسوس کر سکتے ہیں اور اس کے لیے ایمان اور اعمالِ صالح کی شرط ہے۔ قرآن نے اس پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

(10) اگر انسان مومن بن کر اعمالِ صالح کرے تو انسانی ذات آہستہ آہستہ Develop ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی دوران انسانی جسم آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔ انسانی ذات کے بہتر ہونے کے ساتھ ہمارے شعور کی سطح بھی پہلے سے آگے چلی جاتی ہے اور ہمیں انسانی زندگی کی اہمیت کے متعلق بہتر اندازہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ہم قرآن کی روشنی میں انسانی مسائل کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ انفرادی سے Collective سسٹم کی طرف بڑھتے ہیں۔ قرآن نے اس لیے بار بار عقل اور فکر کے استعمال پر زور دیا ہے کیونکہ اِسی لیول کے بہتر استعمال سے انسان بہتر زندگی گزارنے کے قابل ہوتا ہے۔ زندگی ایک انتہائی سنجیدہ Creation ہے اس لیے اس کی ہر جُز یا حصہ کو بھی Seriously لینا پڑتا ہے۔

موت پر اس مختصر روشنی ڈالنے کے بعد ہم ابھی جہنم اور جنت کے موضوع کی طرف چلتے ہیں۔ پہلے جہنم کو لیتے ہیں۔

جہنم:

یہ انسان کی اندرونی کیفیت کا نام بھی ہے۔ جو انسان سوچتا ہے اور کرتا ہے اُس کا اثر چونکہ انسانی ذات پر پڑتا ہے اس لیے منفی اثرات کی وجہ سے انسانی ذات کمزور پڑ جاتی ہے جبکہ مثبت اثرات سے اس میں Progress ہوتی ہے۔ اسی جہت سے قرآن کو سمجھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ نیز جہنم اس دُنیا میں جسمانی سزاؤں کے طور پر بھی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انسانی ذات پر بھی اثرات پڑتے ہیں۔

علامہ پرویز کی کتاب جہانِ فردا میں اس پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

جنت:

جہاں تک اس دُنیا میں انسانی زندگی کا تعلق ہے تو قرآن کے مطابق بنا ہوا معاشرہ جنت کی طرح ہوتا ہے۔ جہاں انسانی معاشی ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں اور اُس کی ذات کے لیے جو نشوونما چاہیئے اُس کی ضروریات بھی معاشرہ پوری کرتا ہے۔ چونکہ یہ معاشرہ قرآن کی مستقل اقدار کے اندر رہ کر وجود پذیر ہوتا ہے اس لیے اس معاشرہ میں خوف اور حزن نہیں ہوتا۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے بھی جہانِ فردا کا مطالعہ کرلیا جائے۔

عام بحث:

اوپر جو کچھ لکھا ہے اَب ہم اس کو باہم ملانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ قرآن انسانی سوچ میں تبدیلی کے لیے بلاتا ہے۔ اس لیے جو بھی تبدیلی ہمارے اندر آتی ہے۔ وہ ہماری اپنی سوچ کی تبدیلی کی مرہون منت ہوتی ہے۔ جیسے جیسے ہم اپنے جذبات او رخواہشات پر قابو پاتے جاتے ہیں اور مستقل اقدار کی روشنی میں اِن سے استفادہ کرتے ہیں ہماری ذات (Character) بہتر ہوتا جاتا ہے۔ یہ تبدیلی ہم خود بھی محسوس کرتے ہیں کیونکہ اپنے ماضی کے واقعات اور اپنے

کردار کی تبدیلی سے ہمیں علم ہوتا جاتا ہے کہ ہم پہلے سے بہتر انسان بن رہے ہیں۔ یہ تبدیلی ہم قرآن کی تعلیم کی روشنی میں Check بھی کرتے جاتے ہیں۔ مثلاً ہم دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ معاملات کو قرآنی اقدار کی روشنی میں غور کر کے طے کرتے ہیں۔ ہم مسائل کا حل ڈھونڈتے ہیں۔ اُن مومنین کے ساتھ ملتے ہیں جنہیں قرآن کی تعلیم میں دلچسپی ہے۔ یہاں پر چند آیات کے حوالے دیتے ہیں مثلاً سورۃ آلِ عمران میں آیت 103 میں کہا گیا ہے کہ: یاد رکھو تم آگ کے کنارے بیٹھے تھے اللہ نے تمہارے دِل جوڑ دیئے۔ یعنی قرآن کے بغیر چونکہ انسان زیادہ خواہشات اور جذبات کی دُنیا میں رہتا ہے اس لیے لڑائی مار کٹائی عام ہوتی ہے۔ آج کی دُنیا اس کی مثال ہے سورہ الحشر میں آیت 19 میں کہا ہے کہ اُن کی طرح نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول گئے اور اللہ نے اُن کو اپنے آپ سے بھلا دیا اور اس طرح وہ زندگی کا اعلیٰ مقصد بھول گئے۔ یہاں بھی قرآن نے ہمارے لیے ایک ریفرنس Reference مہیا کر دی یہ کہہ کر کہ اپنے کردار اور سوچوں کو اُن سے مقابلہ کر کے دیکھ لو جو اللہ کو اپنا ماڈل نہیں بناتے اور مستقل اقدار کی طرف نہیں آتے۔ قرآن ہمیں کہتا ہے کہ موت کو بھی ایک Reference کے طور پر استعمال کرو اور اپنے آپ کو ذات کے لیول پر سوچتے ہوئے اس کو ذہن میں رکھو کہ یہ طبیعی زندگی عارضی اور چھوٹی ہے اُخروی زندگی کے مقابلہ میں لیکن اس طبیعی زندگی کی اہمیت بے حد ہے کیونکہ اس طبیعی جسم کو استعمال کر کے ہی ہم اپنا Seed یا ذات تیار کر سکتے ہیں جس نے اُخروی زندگی کی Environment میں جا کر پھلنا پھولنا ہے اور مزید ترقی کرنی ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ اس دفعہ یہ انسان کے اپنے ہاتھ میں دیدیا کہ وہ اپنی سوچِ فکر کو قرآنی اقدار کی روشنی میں استعمال کرے اور اپنی ذات میں وہ تبدیلی لائے جس کو قرآن نے ہر طریق سے سمجھایا ہے اور ماڈل بھی دیئے ہیں۔ جوں جوں یہ ذات تیار ہوتی جائے گی یعنی انسانی سوچ میں تبدیلی آتی جائے گئی جو کہ اُس کے اعمال اور کردار سے بھی ظاہر ہوئی اُس کی یہاں کی زندگی بھی پہلے سے بہتر سے بہتر ہوتی جائے گی اور اگلی زندگی بھی۔ اس عمل میں وہ ان سب سے فائدہ اُٹھائیں گے۔

(ا) قرآنی تعلیم سے بحیثیت مجموعی اور مستقل اقدار کو یاد رکھ کر اور اُن کا استعمال Reference کے طور پر۔

(ب) اِردگرد کے واقعات کو Study کر کے اور اُن کا تجزیہ کر کے یہ تجزیہ Facts اور مستقل اقدار کی روشنی میں کرنا ہوگا۔ تاکہ حقیقت سامنے آجائے۔

(ج) اپنے کردار میں تبدیلی کا مطالعہ کہ میں کیا تھا اور کیا بن گیا ہوں اور مزید کیا کرنا ہے۔ مثلاً انفرادی سے اجتماعیت کی طرف کا سفر بھی اس سوچ کا حصہ ہے۔

(د) قرآنی پیغام کو دوسرے انسانوں تک پہنچانا اس خواہش کے ساتھ کہ اس سے مجھے فائدہ ہوا ہے (انفرادی طور پر) لیکن اجتماعی نظام کے لیے اور افراد کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ایسا کرنے سے بھی انسانی ذات آگے بڑھتی ہے۔

(ر) اس ساری محنت میں نا اُمیدی اور یاس کو نزدیک نہ آنے دینا۔ خیالات ضرور آئیں گے لیکن قرآن کی تعلیم سے اور اس کے مسلسل استعمال سے اپنے آپ کو Motivate کرنا کہ اللہ کی ذات دیکھ اور سُن رہی ہے۔ اس لیے اس کام کو جاری رہنا چاہئے بغیر نتیجہ کے فوراً سامنے آنے کی اُمید کے۔ اس میں (Frustrated) باتوں سے پرہیز کرنا بہت ضروری ہے اور اپنی Thinking کو مسلسل recognize کرنا بھی ضروری ہے اس سے Self Concious لیول بڑھتا چلا جاتا ہے۔

(ز) شکوک انسان کے ذہن میں مسلسل اُبھرتے ہیں۔ لیکن اِن کو پہچان کر ان کا قرآنی فکر سے ازالہ کرنا ہی ذات کو مضبوط کرتا ہے۔ اس لیے اپنی ذات کا تجزیہ اس کی روشنی میں کرنا ہی ان شکوک کو رفع کرنے میں مدد کرتا ہے۔ جو کام ایمان لانے کے بعد قرآن نے کہا ہے کہ ذات کو آگے جانے میں مدد کرتے ہیں اُن کاموں کے کرنے کے لیے پیہم کوشش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً کسی یتیم، مسکین بہن بھائی کی باقاعدہ مدد کرنا تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ اسی طرح اُن کاموں سے باز رہنا جن سے ذات میں کمزوری واقع ہو سکتی ہے۔ مثلاً غیبت، جھوٹ، اپنے وقت کو ضائع کرنا، منفی جذبات کو پہچان کر اُن سے چھٹکارہ حاصل کرنا۔

(ک) انسانی سوچوں کی کوئی حدود مقرر نہیں ہیں۔ اس لیے یہ سمجھ لینا کہ ابھی مزید سوچنے کی ضرورت نہیں ہے دراصل انسانی ذات کی موت ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز Dynamic ہے۔ جسم کی موت کے آنے تک ایک مومن کا کام ہے کہ وہ مسلسل قرآنی روشنی کی موجودگی میں سوچے اور دوسرے انسانوں کے ساتھ اس کو Share کرے اس میں مومنین بہن بھائی بھی شامل ہیں۔ یہاں پر ایک بہت اہم نقطہ ہے جس کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ایمان کو قرآن نے خود تفصیل سے بیان کر دیا ہے مثلاً سورۃ البقرۃ آیت 177 میں اس کا ذکر کیا ہے اور پھر اس ایمان کے آنے کے بعد اعمال صالح کا ذکر ہے۔ اگر ہم اپنے ایمان کو قرآنی تعلیم کے مطابق سمجھتے ہیں تو اپنے مومن ہونے میں ہمیں شک نہیں ہونا چاہئے۔ یاد رکھیں انسانی ذات مشکوک رہنے کی صورت میں اُس طرح ترقی نہیں کرے گی جس طرح وہ غیر مشکوک رہ کر۔ ہاں البتہ اپنے مومن ہونے کا ڈھنڈورا پیٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(گ) قرآنی ماڈل ہمیں اپنی ذات اور اسلامی نظام کے قیام میں مدد کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت یوسفؑ کا انفرادی ماڈل کہ اکیلا انسان بھی اللہ تعالیٰ کی مدد کا اُسی طرح مستحق بن سکتا ہے جس طرح کہ ایک قوم۔ حضرت موسیٰؑ کی زندگی کا سفر فرعون کے گھر تربیت سے لیکر بنی اسرائیل کی قیادت تک اور اس کے واقعات، فرعون کے دربار میں ایک مومن کی تقریر، نبی کریم ﷺ کی زندگی قرآن کے آئینے میں۔ ہدایت کی تلاش سے لے کر اسلامی نظام کے قیام تک کی رُوداد یعنی انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف مسلسل ترقی۔ حضرت ابراہیمؑ کی روداد، انفرادیت سے ایک چھوٹی جماعت بنانے تک۔ اسی طرح باقی انبیاء کرام کے

ماڈل ہیں جو کسی نہ کسی انسانی زندگی کے Aspect سے روشناس کرواتے ہیں۔

(ل) چونکہ اللہ کی ذات قرآن کی رُو سے انسان کے لیے ماڈل بن جاتی ہے۔ اس لیے جو صفاتِ خداوندی انسان کے لیے مشعل راہ بن سکتی ہیں ان کا سمجھنا اور پھر اُن پر عمل کرنا ہمیں اپنی ذات کو Develop کرنے میں مدد دیتا ہے۔ مثلاً اللہ کی ذات، علیم و خبیر ہے تو ہمارا کام ہے کہ ہم بھی علم حاصل کریں اور اپنے اور عالمی حالات سے باخبر ہوں۔ اس طرح اگر اللہ کی صفات حکیم اور عزیز ہیں تو ہمیں بھی حکمت عملی سے معاملات کو حل کرنا چاہئے اور ہمارے پاس طاقت بھی ہونی چاہئے تاکہ قانون کو لاگو کر سکیں اور نظام کو بنا سکیں۔

(م) کسی بھی عقیدہ، خیال، تھیوری وغیرہ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے انسانی زندگی سے شہادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن کے سچا ہونے کی شہادت اس کو عقل سے سمجھنے اور عملی شہادت سے ثبوت مل جاتا ہے۔ اس پر عمل سے یعنی مستقل اقدار کو یاد کر کے اُن پر انفرادی طور پر عمل کر کے (کیونکہ ابھی نظام نہیں بنا) جو تبدیلی انسان کی فکر اور کردار میں آتی ہے اس کا ماضی کے کردار سے مقابلہ کرنے سے انسان کو خود علم ہو جاتا ہے کہ وہ پہلے سے بہتر انسان بن گیا ہے اور وہ کام کر رہا ہے جو کہ اُس نے پہلے نہیں کیے تھے۔ تو یہ درجہ بہ درجہ انسان کو یقین کی حد سے آگے لے جاتے ہیں۔ اس میں مثلاً ایک بات جو قرآن نے کہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات انسان کے قریب ہے جہاں بھی وہ ہے (57:4) اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے یعنی کوشش کر کے اس کو یاداشت کا حصہ بنا لے اور پھر مستقل اقدار اور قرآن کی تعلیم کی روشنی میں اپنے کردار اور سوچ میں تبدیلی لے آئے۔ اس سے انسان کی فکر اس قابل ہو جاتی ہے کہ وہ اس زندگی کے اعلیٰ مقصد کو اُس طرح سمجھ جائے جس طرح قرآن نے بتایا ہے۔ اس سے انسان موت کی اہمیت کو سمجھنے کے قابل ہو جائے گا اور اپنے اعمالِ زندگی کا جائزہ لے سکے گا۔ اسی سے انسانی شعور اور بیدار ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ اپنے اور دوسروں کے اعمال کو قرآن کی روشنی میں دیکھ کر تجزیہ کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے انسان کو پیہم فکر، کوشش اور دوسروں کے ساتھ باہمی رابطے کی ضرورت ہے۔ یعنی وہ ماحول سے علیحدہ ہو کر نہیں کر سکتا کیونکہ شہادت کا ملنا بہت ضروری ہے اور یہ دوسرے انسانوں کے ساتھ Inter-Action سے ہی مل سکتی ہے۔

آخر میں مختصراً درج ذیل کو ذہن میں رکھا جائے۔

(1) موت صرف انسانی جسم کو آئے گی۔ انسانی نفس یا ذات کو نہیں اور یہ جسم کی موت کے بعد اگلی دُنیا میں دوبارہ زندہ ہوگا۔

(2) قانونِ مکافاتِ عمل انسانی دُنیا میں ہر وقت مصروفِ عمل ہے اور یہ طبیعی زندگی اور انسانی ذات دونوں کو Apply کرتا ہے۔ انسان اپنی سوچ اور فکر کے ذریعہ اِس کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔

(3) ایمان اور اعمالِ صالح (جس طرح قرآن میں ہے) سے انسانی ذات مزید ارتقائی مراحل کے لیے تیار ہوتی جاتی ہے اور یہ عمل اس دنیا سے شروع ہوجاتا ہے۔ اگر اعمال صالح کا پلڑا بھاری ہے تو انسانی ذات کی زندگی جنت کی زندگی کہلاتی ہے۔ قرآن کی تعلیم سے اس کو سمجھا جاسکتا ہے۔

(4) ہر انسان ایک مکمل اکائی (Unit) ہے۔ لیکن ذات کی ترقی کے لیے اس کو دوسرے انسانوں کی ضرورت ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ قرآنی معاشرہ کے لیے کوشش کی جائے تاکہ انسانی زندگی کے مسائل کو بہترین طریقہ سے حل کیا جائے اور ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس سے دوسرے انسان اپنی ذات کو Develop کرسکیں۔ جب تک یہ معاشرہ قائم نہیں ہوتا۔ قرآن کی تعلیم سے انفرادی طور پر فائدہ اٹھانا بھی ذات کی ترقی کا باعث بنتا ہے اور ایسے افراد کو آپس میں Interact کرنا چاہیے۔ دوسروں کو پیغام دینے سے بھی انسانی ذات نشوونما پاتی ہے۔

(5) موت کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے اُس کو Reference کے طور پر ذہن میں رکھنا ضروری ہے کیونکہ اس سے وقت کی اہمیت اُجاگر ہوجاتی ہے اور انسان اعمالِ صالح (ایمان کے بعد) کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ اس سے انسان کو مزید اچھے کام کرنے کے لیے جذبہ محرکہ ملتا ہے۔

(6) موت کی موجودگی اس یعنی اس دُنیا کی انسانی زندگی کی اہمیت کو اُجاگر کرتی ہے۔ اس زندگی کے اعمال پر نہ صرف اس دُنیا کی زندگی اثر پذیر ہوتی ہے بلکہ اس سے اگلی زندگی یا آخرت کی زندگی بھی متاثر ہوتی ہے۔ چونکہ انسانی ذات کو موت نہیں آتی اس لیے اس کی ارتقائی زندگی انتہائی اہم ہے تاکہ جسم کی موت کے بعد یہ مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوجائے۔ اس کو ہم قرآن کی تعلیم کی روشنی میں آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ یاد رکھیں کہ اس قرآنی تعلیم کے لیے ہمیں خود اپنے اندر اس کی خواہش پیدا کرنی پڑے گی اور پھر ضرورت کے طور پر قرآن کی طرف آنا چاہیے۔ اگر یہ خواہش اور ضرورت پیدا نہیں کریں گے تو ہم کبھی بھی قرآن سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے جس کا نتیجہ قانون مکافاتِ عمل کے مطابق ہمیں کبھی بھی نہیں ملے گا۔ یعنی ہماری ذات اُس طرح نہیں بنے گی جو کہ اگلے ارتقائی مراحل میں جاسکے۔

اس آرٹیکل کے سلسلہ میں اگر کوئی سوال یا Comment ہو تو آپ مجھے میری Email پر رابطہ کرسکتے ہیں۔

ادارہ طلوع اسلام کا ای میل ایڈریس Idarati@gmail.com

رسالہ نہ ملنے کی صورت میں مندرجہ ذیل نمبرز پر رابطہ کریں شکریہ
Cell: 0321-4460787 Phone: 042-35714546

ماہنامہ طلوعِ اسلام کی نئی قیمت

2016ء میں ''طلوعِ اسلام'' کا زرِ شرکت درجِ ذیل ہے

اندرون ملک:

فی پرچہ: 50 روپے	سالانہ: 550 روپے	بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے

بیرونِ ملک:

سالانہ: 2500 روپے	بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک: 4000 روپے

ہماری کوشش رہتی ہے کہ طلوعِ اسلام کو خوب سے خوب تر کیا جائے جس کا اندازہ آپ کو بھی ہوگا پاکستان میں چھپائی کا سامان روز بروز مہنگا ہونے کی وجہ سے ہمیں دو تین سال بعد مجبوراً زرِ شرکت میں اضافہ کرنا پڑتا ہے تاکہ آمدن اور اخراجات میں توازن پیدا کیا جا سکے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ '' طلوعِ اسلام '' اب آن لائن ہماری ویب سائٹس اور سوشل میڈیا جیسا کہ فیس بک، ٹوئٹر وغیرہ پر بھی فری دستیاب ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے قارئین بلا قیمت اِس کو انٹرنیٹ کے ذریعے پڑھتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں آپ کے تعاون کی مزید ضرورت ہے تاکہ یہ سلسلہ خوش اسلوبی سے چلتا رہے۔

اِدارہ طلوع اسلام کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات درجِ ذیل ہیں

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465-22-003082-7

For International Transactions
IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827
Swift Code : NBPAPKKAA02L

National Bank of Pakistan Main Market, Gulberg Lahore

ادارہ طلوعِ اسلام 25-B گلبرگ نمبر 2، لاہور۔ 54660، (پاکستان)
فون: 042-35714546 E-mail: idarati@gmail.com

محمد اکرم راٹھور، لاہور

میثاقِ مدینہ

(قراردادِ معاہدہ)

13 جنوری 2012ء کے روزنامہ ایکسپریس لاہور میں 'میثاقِ مدینہ کیا کہتا ہے' کے عنوان سے جناب انتظار حسین صاحب (بندگی نامہ) کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں بتایا گیا کہ قائداعظم لائبریری میں ایک مجلسِ مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا تھا جس کا موضوع تھا 'قائداعظم کس قسم کا پاکستان چاہتے تھے' اس مذاکرے کی صدارت ڈاکٹر جاوید اقبال مرحوم کر رہے تھے۔ اس مباحثہ میں قائداعظم کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کا حوالہ آیا تھا۔ انہوں نے میثاق مدینہ کا حوالہ دیا اور سوال کیا کہ کیا قائداعظم کی یہ تقریر میثاقِ مدینہ سے انحراف ہے۔ اگر ہے تو بتایا جائے کہ کیسے۔ انہوں نے وضاحت کی کہ میثاقِ مدینہ کے تحت جو سٹیٹ قائم ہوئی تھی اس سٹیٹ یا اس مملکت میں تو (مسلمانوں کے علاوہ) عیسائی بھی تھے' یہودی بھی تھے' مشرکین بھی تھے۔ میثاق مدینہ نے ان سب کو وحدت قرار دیا تھا۔

5 فروری 2012ء کے روزنامہ ایکسپریس لاہور کے مطابق صوبائی سیرت کانفرنس سے صدارتی خطاب کرتے ہوئے وزیراعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف صاحب نے کہا تھا کہ اسلام کی ابدی اور ہمہ گیر تعلیمات پر عمل کر کے مثالی معاشرہ بن سکتا ہے۔ اسوۂ حسنہ پر عمل کر کے معاشرے میں عدل و انصاف کی حکمرانی قائم کی جاسکتی ہے۔ ذاتی معاملات کو ایک طرف رکھتے ہوئے آج غیر مسلم معاشروں میں پائی جانے والی اچھائیاں میثاقِ مدینہ کی جھلک محسوس ہوتی ہیں۔ میثاق مدینہ پر عمل کر کے ملک کو فلاحی ریاست بنایا جاسکتا ہے۔ میثاقِ مدینہ کی اہمیت اور افادیت کے پیشِ نظر محمد حسین ہیکلؒ کی کتاب 'حیاتِ محمد ﷺ' مترجم ابو یحییٰ امام خاں شائع کردہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ 2' کلب روڈ' لاہور سے اقتباس نیچے دیا جارہا ہے:

قراردادِ معاہدہ:

رسول اللہ ﷺ نے ان تمام نزاکتوں (ص 484) کو مدنظر رکھتے ہوئے مہاجر و انصار کے درمیان ایک تحریری معاہدہ مرتب فرمایا جس (معاہدہ) میں یہود کو بھی شامل کرلیا گیا جس کی رو سے انہیں اپنے دین پر قائم رہنے میں پوری آزادی دی گئی اور ان کے مال و جائیداد کی باہمی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈال دی گئی۔

متن قراردادِ معاہدہ:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ معاہدہ ہے جو محمد نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نگرانی میں مندرجہ ذیل طبقات وقبائل میں ہوا۔

مہاجر مسلمان، قریش مکہ اور انصار (مسلمانان یثرب اور ان دونوں کے ساتھ جو جو غیر مسلم طبقات وگروہ ملحق ہیں) کے درمیان جس کے شرائط یہ ہیں:

1- مہاجرین وقریش ایک ہی جماعت ہیں۔

2- مہاجرین جو قریش مکہ میں سے ہیں فوجداری جرائم پر اپنے آدمیوں کی طرف سے (دوسروں کو اور خود آپس میں بھی) مقررہ دیت یا خون بہا ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔

3- اور اگر ان کے کسی آدمی پر کسی نے ایسا ظلم کیا جو فوجداری میں آسکتا ہے تو وہ اس کی دیت یا خون بہا وصول کرنے کے مستحق بھی ہوں گے۔ اور فدیہ یا دیت کی صورت میں قریش اور ان کے مقابل ہر دو کو ادا کردہ رقم یا مال کے عوض میں اپنے آدمی کو قید سے رہا کرانے کا حق ہوگا۔

4- مدینہ کے رہنے والوں میں بنوعوف کے حقوق کا وہی لحاظ ہوگا جو ان میں پہلے سے رائج ہے جس کے مطابق انہیں دیت اور خون بہا لینے اور ادا کرنے کی پابندی کرنا ہوگی اس معاملہ میں کسی فریق کو کسی پر ترجیح یا تفوق نہ ہوگا (*)۔

5- ادائے دیت اور خون بہا دینے کی صورت میں مسلمان اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کوئی اور راستہ نکالنے کی کوشش نہ کریں گے۔

6- کوئی مومن دوسرے مومن کے غلام پر قبضہ نہ کرے گا۔

7- مسلمانوں کا فرض ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی شخص پر زیادتی کرے تو سب مل کر ایسے شخص کو سزا دیں گے اگرچہ سزا دینے والوں میں سے مجرم کسی کا فرزند ہی کیوں نہ ہو۔

8- مسلمان ایک دوسرے کو کسی کافر کی طرف داری میں قتل نہ کریں گے نہ مسلمان کے خلاف کسی کافر کی نصرت کریں گے۔

خدا تعالیٰ کا ذمہ سب کے لئے مساوی ہے:

9- یہودیوں میں سے جو شخص ہمارے معاہدہ کی پابندی کا وعدہ کرے ہماری نصرت اور یاوری اس کے لئے بھی ہے اس کے دشمن کے مقابلہ میں ہم اس کے دوش بدوش مقابلہ میں شریک رہیں گے۔

10- مسلمانوں میں سب کا درجہ مساوی ہے گر جہاد میں ایک مسلمان دشمنوں سے صلح کرے تو یہ صلح تمام مسلمانوں کو

منظور ہوگی لیکن کوئی مسلمان عدل وانصاف چھوڑ کر کفار کے ساتھ صلح نہیں کرسکتا۔

11- غیر مسلمین کا جو لشکر ہمارے ساتھ شریک جہاد ہوگا وہ نوبت بہ نوبت مورچہ پر آئے گا۔

12- کافروں سے بدلہ لینے کے لئے مسلمان ایک دوسرے کی اعانت کریں گے۔

13- مشرکین مدینہ میں جو لوگ معاہدہ میں شریک ہیں ان میں سے کوئی شخص قریش مکہ میں سے کسی کے مال اور جان کو نہ تو پناہ دے گا اور نہ مسلمان کے مقابلہ میں مکہ کے کسی قریشی کی حمایت کرے گا۔

14- اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو اس کے خلاف گواہی حاصل ہونے کے بغیر قتل کر دے گا تو اس شخص سے قصاص لیا جائے گا ماسواء اس صورت کے کہ مقتول کے وارث قاتل کو معاف کر دیں یا دیت لینے پر رضامند ہو جائیں۔

مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرنے سے ہاتھ نہ روکنا چاہئے اور تمام مومن ایک دوسرے کے دوست دار ہیں۔

یہود کے لئے:

15- تمام مسلمان اس معاہدہ پر متفق ہیں اور وہ اس میں سے کسی دفعہ کا انکار نہیں کر سکتے جس مسلمان نے اس معاہدہ کا اقرار کر لیا وہ خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے۔

16- کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی مجرم کو پناہ دے۔ ایسے شخص پر قیامت کے روز خدا اور اس کے رسول کی لعنت اور غضب ہوگا اور اس کی کوئی نیکی قبول نہ ہوگی اور نہ قیامت کے روز اس شخص سے ایسے گناہ کے عوض میں کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا۔

17- مسلمان اپنے باہمی اختلاف میں خدا اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرنے کے پابند ہیں۔

18- اگر مسلمان جہاد میں اپنا مال خرچ کریں تو یہود کو بھی ان کے ساتھ اپنا مال خرچ کرنا ہوگا۔

19- قبیلہ بنی عوف کے یہود بھی اس معاہدہ میں شامل ہیں اگرچہ مسلمان اور یہودی ہر ایک اپنے اپنے مذہب پر قائم رہنے کا مستحق ہوگا لیکن مشترکہ مقاصد میں دونوں ایک جماعت کے حکم میں داخل ہوں گے۔

20- مسلمان اور یہود دونوں کے غلام اپنے اپنے آقاؤں کے مطابق معاہدہ میں داخل شمار کئے جائیں گے۔ شرکائے معاہدہ میں جو شخص ان واقعات کی خلاف ورزی کرے گا وہ اپنی ذات اور اپنے گھر بار کے نقصان کا خود ذمہ دار ہوگا۔

21- (دفعہ 19 کے مطابق) مندرجہ ذیل یہودی قبائل بھی اس معاہدہ میں شامل سمجھے جائیں گے یعنی بنو نجار، بنو حارث، بنو ساعدہ، بنو جشم، بنو اوس، بنو ثعلبہ، بنو جفنہ، بنو شغیبہ اور وہ لوگ بھی جو ان میں سے کسی قبیلہ کے ساتھ منضم ہیں اس معاہدہ میں شامل

سمجھے جائیں گے۔

22- بنوثعلبہ کے غلام بھی اس معاہدہ میں شریک متصور ہوں گے۔

23- اس معاہدہ میں سے کوئی شخص (جناب) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اجازت کے بغیر مستثنیٰ قرار نہ دیا جائے گا۔

24- ہر قاتل سزا کا مستحق ہوگا۔

25- جو شخص کسی کو فریب سے قتل کرے گا اس کا ذمہ دار اس کا اصل قاتل ہوگا اور اگر وہ مفرور ہو گیا تو قاتل کے ورثاء سے انتقام لیا جائے گا۔

26- لیکن جب کسی مظلوم کے ہاتھ سے قتل ہو جائے تو یہ قتل پہلی صورت (نمبر 25) سے مختلف ہوگا (یعنی اس پر مواخذہ کم کر دیا جائے گا یا بالکل ساقط ہوگا: م:)

27- کسی شخص کو اپنے حلیف کے جرم کی وجہ سے ماخوذ نہ کیا جائے گا لیکن مظلوم کی دادرسی بہرصورت کی جائے گی۔

28- مسلمانوں کی لشکر کشی کی حالت میں یہود کو بھی ان کی مالی اعانت کرنا ہوگی کیونکہ حلیف کے لئے دفع مضرت اپنے نفس کی حفاظت کے مطابق کرنا چاہئے جب تک کہ اس کی جانب سے ضرر نہ پہنچے یا اس کے ذمہ کوئی جرم عائد نہ ہو۔

29- حلیف کے مقدمات خود انہی کی طرف سے قابل سماعت متصور کئے جائیں گے۔

30- اس معاہدہ کے مطابق طبقات و افراد میں سے شخص سے خلاف ورزی ہو یا اس سے کوئی خطرہ لاحق ہو تو اسے خدا اور اس کے رسول (محمد) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا اور نفس معاہدہ کی حقیقی پابندی اللہ کے سواء کسی پر منکشف نہیں ہو سکتی۔

31- اس معاہدہ کے مطابق نہ تو قریش کو پناہ دی جا سکتی ہے نہ ان کے کسی مددگار کو۔

32- اگر مدینہ پر کوئی قوم حملہ کرے تو دشمن کی مدافعت میں سب کو مل کر حصہ لینا ہوگا۔

33- اگر مدینہ پر حملہ آور لشکر مسلمانوں سے صلح کرنا چاہے تو معاہدہ کے شرکاء کو متفق ہو کر دشمن سے صلح کرنا ہوگی۔

34- اسی طرح اگر مسلمانوں کے سوا دوسرے شرکائے معاہدہ پر حملہ ہوا اور وہ لوگ جن کی وجہ سے حملہ ہوا ہے دشمن سے صلح کرنا چاہیں تو مسلمان ان کے ساتھ اس معاہدہ کے پابند ہوں گے باستثنائے اس معاملہ کے جس میں شرکائے معاہدہ میں سے کسی کے دین پر زد پڑتی ہو۔

35- شرکائے معاہدہ میں ہر شخص کو اسی قدر استحقاق ہوگا جتنا حق اس کی قوم یا اس کے گروہ کے ساتھ طے کیا گیا ہے۔

36- قبیلہ اوس کے یہود اور ان کے غلاموں کو دوسرے معاہدین پر کوئی ترجیح نہ ہوگی۔ ان سب میں جو شخص پرہیزگاری

کے ساتھ معاہدہ پر عمل پیرا ہوگا عنداللہ وہ بہتر ہوگا کہ نیکی اور بدی دونوں کا فرق واضح ہے اور یہ قرارداد معاہدہ کسی ظالم اور مجرم کی حمایت نہ کرے گی۔

37- شرکائے معاہدہ میں سے اگر کوئی شخص مدینہ میں اپنی سکونت رکھے یا اس کے باہر بسیرا کرے ارتکاب جرم کے بغیر اس پر مواخذہ نہ ہوگا۔

خاتمہ! اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے امن وسلامتی ہے اس شخص کے لئے جو نیکی کا طلب گار اور خدا سے ڈرنے والا ہو! (فقط)

یہ تحریری معاہدہ ہے جس کی رو سے جناب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے آج سے تقریباً سوا چودہ سو سال قبل معاشرہ انسانی میں ایسا ضابطہ قائم کیا جس سے شرکائے معاہدہ میں سے ہر گروہ اور فرد کو اپنے اپنے عقیدہ میں آزادی کا حق حاصل ہوا۔ انسانی زندگی کی حرمت قائم ہوئی اموال کے تحفظ کی ضمانت مل گئی ارتکاب جرائم پر گرفت ومواخذہ نے اپنا دباؤ ڈالا اور معاہدین کی یہ بستی (شہر مدینہ) اس میں رہنے والوں کے لئے امن کا گہوارہ بن گئی۔ غور فرمایئے کہ سیاسی اور مدنی زندگی کو ارتقاء کا کتنا بلند مرتبہ حاصل ہوا جس سیاست ومدنیت (دونوں) پر ابھی تک دست استبداد مسلط تھا اور دنیا فساد وظلم کا معمل بنی ہوئی تھی۔

ابتدا میں یہود مدینہ کے (3) خاندان اس معاہدہ میں شریک نہ تھے بنوقریظہ، بنونضیر اور بنوقینقاع! لیکن یہ تینوں قبیلے بھی تھوڑے عرصہ کے بعد شامل ہو گئے معاہدہ کی پابندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر (مدینہ) اور اس کا سواد اس میں بسنے والوں کے لئے حرم (امن کی جگہ) بن گیا۔ انہوں نے اپنا فرض سمجھ لیا کہ اگر کسی نے ہمارے شہر پر حملہ کیا تو ہمیں اس کی حرمت قائم رکھنے کے لئے اپنا خون بہانے میں تامل نہ ہوگا اور وہ ہر ایسے معاملہ میں اپنے رفقاء کی معاونت کریں گے تاکہ جس شہر میں رہتے ہوئے انہوں نے معاہدہ کیا ہے اس شہر کی عزت ورفعت پر حرف نہ آئے۔

مولانا صفی الرحمن مبارک پوری مرحوم اپنے ترجمہ اور تصنیف 'الرحیق المختوم' کے صفحہ 319 پر لکھتے ہیں کہ اس معاہدے کے طے ہو جانے سے مدینہ اور اس کے اطراف ایک وفاقی حکومت بن گئے جس کا دارالحکومت مدینہ تھا اور جس کے سربراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔

پرویزؒ اپنی تصنیف 'معراجِ انسانیت' کے صفحہ 229 پر اس معاہدے کے متعلق رقم طراز ہیں:

اس طرح مدینہ میں اندرونی سازشوں اور بیرونی خدشات کے امکانات کو کم کرنے کے بعد، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی جماعت کی تعلیم وتربیتِ خصوصی کی طرف متوجہ ہو گئے کہ اصل کام ان افرادِ صالحہ کو ایک خیر امت میں تبدیل کر کے انہیں عالمگیر انقلاب کا اولین خمیر بنانا تھا تاکہ اس کے بعد، وہ نوعِ انسانی کے جس آٹے میں جا کر ملیں، اس میں بھی وہی خمیر پیدا ہو جائے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (2:143)-

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com
www.azharabbas.com

تحریک طلوعِ اسلام کا مقام بلند

قرآن کریم نے قوموں کی موت، زندگی کے ابدی قوانین دے دیئے ہیں اور یہ بات واضح فرمادی کہ جو قوم ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی اسے زندگی کی خوشگواریاں نصیب ہوں گی اور جو قوم ان کے خلاف جائے گی وہ تباہ و برباد ہوجائے گی۔ جو قوم اپنے معاشرہ کو باطل بنیادوں پر تعمیر کرتی ہے۔ وہ اپنے باطل نظام کی وجہ سے تباہ ہوجاتی ہے۔ اس قوم کی تباہی خود اس نظام کی بنیادوں کے اندر مضمر ہوتی ہے۔ اس کا نام قانونِ مکافاتِ عمل ہے۔ یہ نتائج خدا کے اس قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں جن قوانین میں کوئی شخص ردِ و بدل نہیں کرسکتا اور نہ ہی کسی میں یہ قوت ہے کہ وہ ان قوانین کے نتائج کو بدل دے۔ قوموں کے عروج و زوال کے فیصلے اسی غیر متبدل قوانین کے مطابق ہوتے ہیں۔

انبیاء کرام ایسا ہی انسانیت ساز نظام لیکر تشریف لاتے تھے جو مردہ قوموں کی حالت بدل کر ان کو زندگی عطا کرتے تھے۔ قرآنِ کریم نے اسی نظام کی طرف دعوت دی تھی جب فرمایا تھا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ۚ (8:24) ایمان والو، تم اللہ و رسول (نظام خداوندی) کی آواز پر لبیک کہو جب وہ تمہیں اس بات کی دعوت دیتا ہے جو تمہیں زندگی عطا کرنے والی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے بھی یہی دعوت دی تھی وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ (3:49) میں اللہ تعالیٰ کے قوانین کے مطابق مردہ قوم کو زندہ کرتا ہوں۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کی قوم نے بھی زندگی حاصل کی تھی (61:14) اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو وہ نظام دیا جس کے متعلق حضورؐ نے خود فرمایا تھا لقد ترکت علی مثل البیضاء لیلھا ونھارھا سواء۔ میں تم میں وہ ملتِ بیضاء چھوڑے جارہا ہوں جس کی رات اس کے دن کی مانند روشن ہوتی ہے۔ لیکن آج اس بدنصیب قوم کا دن بھی رات کی طرح تاریک ہے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم نے اس نظام کو چھوڑ کر وہ نظام اختیار کیا جس کے دن بھی راتوں کی طرح تاریک و بھیانک ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قائم کردہ نظام وہ تھا جو صفات خداوندی پر استوار ہوا تھا۔ اس لیے اس نظام میں ہر فرد کی پوری پوری صلاحیتیں بیدار ہوگئی تھیں (3:164)، (62:2) اس نظام میں رزق کی فراوانی تھی۔ وہ نظام تمام اقوام عالم کی نگرانی کرتا ہے۔ (22:78)، (5:8)، اس نظام کے ذریعے دعائیں پوری ہوتی ہیں (27:62)، (58:1)، سب سے بڑی اہم بات یہ ہے کہ صرف اور صرف اس نظام کے ذریعے، اللہ کی عبادت اور رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے جب اس نظام

پر عمل کرنا چھوڑ دیا، تو وہ دنیا میں کسی حال میں نہیں رہے۔ ہمارے لیے ہی قرآنِ کریم نے فرمایا تھا کَیْفَ یَهْدِی اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (3:86) جس قوم نے صحیح نظام قائم کرنے کے بعد اس نظام کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ اس نظام کے روشن نتائج نے یہ واضح کر دیا تھا کہ اُن کے رسول نے جو کچھ کیا تھا وہ بالکل حقیقت پر مبنی تھا۔ اس ایمان کے بعد کفر اختیار کرنے کا جو نتیجہ ہے وہ اس قدر بھیانک ہے کہ ہم مسلمانوں کا دل ہی نہیں مانتا کہ ہم یہ خیال کریں کہ یہ ہمارا ہی تذکرہ ہو رہا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم اس طرح کسی کو غلط فہمی میں مبتلا رہنے کی اجازت نہیں دیتا، وہ تو ہر طرف سے گھیر لیتا ہے، اور اس کے دلائل کی کوئی تردید و تغلیط نہیں کر سکتا۔

قرآنِ کریم نے عبادت کا لفظ ٹھیٹھ محکومیت کے لیے استعمال کیا ہے۔ جس کے بے شمار حوالہ جات سابقہ مضامین میں دیئے جا چکے ہیں، (12:40,18:110,23:47) عبادت کے اس ترجمہ کو سامنے رکھ کر یہ آیۂ کریمہ ملاحظہ فرمائیں کہ یہ آیت کس طرح ہمارا اپنا حال بیان کر رہی ہے ارشاد ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ (40:60)، جو لوگ میری محکومیت سے تکبر کرتے ہیں وہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔ قرآن کریم نے اللہ کی محکومیت سے تکبر کرنے کا جو انجام ہوتا ہے، وہ جہنم بتایا ہے جس میں ہم داخل ہو رہے ہیں۔ قرآنِ کریم نے صرف اس اصول کو ہی بیان نہیں کیا بلکہ تاریخ سے اس کی شہادت میں قوم عاد کی مثال کو پیش فرمایا ہے جبکہ ارشاد ہے وَتِلْكَ عَادٌ ۗ جَحَدُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ۝ وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ (11:59-60)، ترجمہ: اور یہ قوم عاد ہی تھی کہ جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیات کا انکار، اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر ستم گر اور حق کے دشمن کے حکم کی پیروی کی۔ اس جہاں میں ان کے پیچھے لعنت اور رسوائی رہی، اور قیامت میں (کہا جائے گا کہ) جان لو کہ عاد نے اپنے پروردگار سے کفر و انکار کیا۔ دور ہو عاد، قوم ہود۔

ہر مسلمان کی زندگی کا مقصد اللہ کی بادشاہت کو اس دنیا میں قائم کرنا ہے اور حضورؐ نے اس کو عملاً نافذ کر کے بھی دکھا دیا تاکہ پوری انسانیت کو بخوبی معلوم ہو جائے کہ وہ نظام قابل عمل ہے، صرف ایک Utopia نہیں ہے۔ ساری دنیا نے کھلی آنکھوں سے اس کے عمدہ نتائج اور ثمرات کو بھی دیکھا۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے اس کے ثمرات دیکھنے کے باوجود اس نظام کو چھوڑ دیا اور پھر چھوڑا بھی ایسا کہ پھر خلافتِ راشدہ کے بعد سے اس طویل مدت میں کسی تحریک یا کسی مفکر نے اس دین کو قائم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی، کوشش تو کُجا، اس نظریہ کو ہی تیاگ دیا اور دین کے مستحکم اور انسانیت پرور نظام کو چھوڑ کر، اس کو مذہب میں تبدیل کر دیا۔ نظام میں اطاعت ہوتی ہے۔ لیکن مذہب میں اطاعت ضروری نہیں ہوتی۔ مذہب کی حدود صرف پرستش تک ہی سُکڑ جاتی ہیں۔ مسلمان مذہب کے عادی ہوئے اور انہوں نے اپنے قرآنی نظریات کو چھوڑ کر اپنے

نظریات کو بھی مذہب کے ساتھ Adjust کرلیا۔ لیکن گذشتہ صدی اس بارے میں بڑی خوش بخت رہی کہ اس صدی میں تحریک طلوع اسلام کی ابتداء ہوتی ہے اور اس کے مشہورِ زمانہ رسالہ طلوع اسلام کی اشاعت شروع ہوئی۔ تقسیم ہند کے بعد جنوری 1948ء سے آج تک یہ رسالہ جاری ہے خلافتِ راشدہ کے بعد سے آج تک کے اس طویل عرصہ میں ہمارے ہاں سینکڑوں کی تعداد میں علماء وفقہا، اور مفکرین پیدا ہوئے اور ان میں سے ایک بڑی تعداد نے مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن مسلمانوں کی حالت نہ سنورنی تھی اور نہ ہی سنوری۔ کیونکہ ان سب مفکرین و مصلحین کی مسلمانوں کے زوال کے اصل سبب تک رسائی نہیں ہوئی قرآنِ کریم نے مسلمانوں کے زوال کا جو اصل سبب بتایا تھا، اور جو ہم نے اسے اس مضمون میں اوپر تحریر کردیا ہے وہ یہی تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی محکومیت کو چھوڑ کر انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی محکومیت شروع کردی۔ حالانکہ قرآنِ کریم کی رُو سے سب سے بڑا شرک ہی یہ ہے کہ حکومت کسی کی ہو اور پرستش کسی کی۔ نزول قرآن سے پیشتر ہر جگہ اور ہر سطح پر عبادت کا مفہوم پرستش ہی تھا اور ہر جگہ مذہب ہی مذہب تھا۔ دین کا تصور قرآن نے دیا اور دین کا قائم کرنا ہی مسلمانوں کو زوال سے نکالنے کا واحد طریقہ ہے۔ تحریکِ طلوع اسلام نے اس اصل مرض کی تشخیص کردی جو اس سے پہلے کسی مفکر و مجدّد نے نہیں کی تھی پھر طلوع اسلام نے اس نظریہ کو اس طاقت اور قوت سے پھیلایا کہ آج ساری دنیا میں ہر طرف سے، مسلمانوں کے ہر ملک میں اقامت دین کی آوازیں بلند ہونی شروع ہوگئی ہیں۔ لیکن چونکہ ان جماعتوں نے تحریکِ طلوع اسلام سے براہِ راست رابطہ قائم نہیں کیا۔ اس لیے وہ اب بھی مذہب کے دائرہ میں رہ کر ہی، اقامتِ دین کی کوشش کررہی ہیں، اس لیے ان کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکیں۔ اقامت دین کی داعی سب جماعتیں یہ سمجھتی ہیں کہ مذہب کو ہی ٹھوک ٹھاک کے درست کرلینے سے دین کی اقامت ہوجاتی ہے۔ لیکن ان کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ کیونکہ مذہب اور دین ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں اور جو حضرات دین کے داعی ہیں انہیں مذہب کے عقائد کو بالکل ترک کرنا ہوگا۔ جب تک وہ اپنے عقائد خالص قرآنی نہیں کریں گے۔ نہ وہ دین قائم کرسکیں گے اور نہ ہی دین قائم ہوسکے گا۔ اس موجودہ دور میں اس کی واضح مثال ایران کا انقلاب ہے کہ وہ اتنی قربانیوں کے باوجود بالکل ناکام ہوگیا۔ ہم ان نظریات کی نشاندہی کرتے ہیں جو اقامت دین میں مانع ہیں اور اقامت دین کی داعی ہر جماعت کو ان عقائد کو ترک کرنا ضروری ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کم وبیش بیاسی دفاعی لڑائیوں کے بعد مدینہ میں اسلامی نظام رائج فرمایا جو ان کی حیات مبارکہ میں ہی پھیل کر پورے جزیرہ عرب تک وسیع ہوگیا تھا۔ اس کا رقبہ دس لاکھ مربع میل پر مشتمل تھا۔ چونکہ اس ریاست کا رقبہ وسیع تھا اور ہر شخص اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے مدینے نہیں آسکتا تھا۔ اس لیے حضورؐ نے اپنی اس وسیع وعریض ریاست کے انتظام کے لیے مقامی احکام مقرر فرمائے تھے قرآنِ کریم نے اُنہیں اولوالامر کے نام سے موسوم کیا ہے اور قرآنِ کریم نے اولوالامر کی اطاعت بھی

فرض قرار دی ہے (4:59)۔ اس لیے اطاعت خداوندی کی ترتیب اس طرح قرار پائی کہ اللہ کی اطاعت رسول کے ذریعہ ہوتی ہے (4:80) اور رسول کی اطاعت اولوالامر کے ذریعے ہوتی ہے (4:59)، اس طرح یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی اطاعت نہیں رہتی بلکہ اس نظام کی اطاعت ہوجاتی ہے جو حضور نے قائم فرمایا تھا اور اس نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت قرار پاجاتی ہے اور اس طرح قرآنِ کریم نے انسان پر انسان کی حکومت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرکے انسان کو اس کے بلند مقام سے آگاہ کیا۔ حضورؐ کے دور میں جو حضرات حضورؐ سے دور فاصلے پر کسی شہر میں مقیم ہوتے اور ان کے مابین باہمی تنازعات ہوتے تھے تو وہ لوگ اپنے تنازعات کا فیصلہ کرانے مدینہ، حضورؐ کے پاس حاضر نہیں ہوتے تھے بلکہ اپنے مقامی حاکم سے ان تنازعات کا فیصلہ کرالیتے تھے اور ان کے فیصلوں کی اطاعت کرتے تھے۔ مقامی حکام کے فیصلوں کی اطاعت ہی حضور کی اطاعت ہوتی تھی۔ حضور کی موجودگی میں حضورؐ کی اطاعت کے اس طریقہ پر سب کو اتفاق ہے۔ ہمارے علماء بھی اولوالامر کی اطاعت کرنا فرض سمجھتے ہیں۔ اصل مسئلہ حضورؐ کے بعد حضورؐ کی اطاعت کرنے کے طریقے پر ہے۔ تحریک طلوع اسلام، قرآنی تعلیم کے مطابق، حضورؐ کی اطاعت کو حضورؐ کے انتقال کے بعد اس زندہ اتھارٹی کی طرف پھیر دیتی ہے، جو اس نظام کی آخری اتھارٹی ہوتی ہے اس طرح حضورؐ کی اطاعت، حضرت ابوبکرؓ کی طرف منتقل ہوجاتی ہے کیونکہ حضرت ابوبکرؓ اس نظام کی زندہ اتھارٹی تھے اور ان کی اطاعت اسلامی نظام کی اطاعت تھی، جو خود رسول اللہؐ کی اطاعت کے مترادف تھی۔ ہمارے ہاں جب خلافتِ راشدہ کے انقراض کے دوسو سال بعد، اسلامی لٹریچر وجود میں آیا تو اس دور کے خلفاء بنوعباس اس قدر بدچلن تھے کہ ان کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت کے مترادف قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ یہ وہ مشکل تھی جس کو حل کرنے کے لیے ہمارے مفسرین کرام نے اطاعتِ رسول کو نظام کے سربراہ (خلیفہ) کی طرف پھیرنے کی بجائے، روایاتِ رسولؐ کی طرف منتقل کردیا اور حضورؐ کی اطاعت روایات کے ذریعے ہونا قرار پاگئی۔ جب اللہ و رسول کی اطاعت قرآن اور روایات کے ذریعے بآسانی ہونے لگی، تو پھر اطاعتِ رسول کے لیے نظام کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی، اور اسلامی نظام کا تصور ہی آنکھوں سے بالکل اوجھل ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرآن کے ذریعے اور رسول کی اطاعت روایات کے ذریعے ہونے لگی اور ہمارے علماء کرام نے ان اطاعتوں کو دو اطاعتیں قرار دے دیا۔ اللہ و رسول کی اطاعت کو دو اطاعتیں قرار دینا قرآنِ کریم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم نے ان دونوں اطاعتوں کو ایک اطاعت قرار دیا ہے اور اس ایک اطاعت کے لیے اللہ و رسول کے دو الفاظ تو استعمال کیے ہیں، لیکن ان سے مراد اسلامی مملکت کا مرکز اور اس کی زندہ اتھارٹی ہوتی ہے اور ان دونوں کے لیے قرآن نے ہر جگہ واحد کا صیغہ اور واحد کی ضمیر استعمال کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

(1) اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا

اَجْرٌ عَظِیْمٌ (3:172) ترجمہ: جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پکار کا جواب دیا باوجودیکہ وہ زخم کھا چکے تھے۔ ان میں جو لوگ نیک کردار اور متقی ہیں یقیناً ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔

(2) یہودیوں نے مدینے میں اس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے حضور سے کیا تھا۔ اس عہد شکنی کو ''خدا اور رسول'' کی مخالفت کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ اسلامی نظام کی مخالفت تھی ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (59:4) ترجمہ: یہ اس لیے ہے کہ اُنہوں نے ''اللہ اور اس کے رسول'' کی مخالفت کی ہے۔ جو کوئی اللہ کے حکم کی مخالفت کرتا ہے، تو اللہ کا قانون سخت سزا دینے والا ہے۔

(3) اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا (33:57) ترجمہ: جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں ذلت آمیز عذاب ہے اور خدا کی لعنت۔ اس آیت میں اگر اللہ سے مراد اس کی ذاتِ عالی اور رسولؐ سے مراد ذاتِ رسالت مآب لی جائے تو اس کا کوئی مفہوم بنتا ہی نہیں۔ کیونکہ اللہ کو کس طرح اذیت دی جاسکتی ہے۔ اس کا تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اللہ و رسول کو ایذا پہنچانے کا مقصد نظام خداوندی کو نقصان پہنچانا ہے۔

(4) بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ (9:1)، جن مشرکوں سے تم نے معاہدہ کیا تھا ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بری الذمہ ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے۔

اس بارے میں کہ قرآنِ کریم نے ''اللہ و رسول'' کے الفاظ بطور ایک اصطلاح کے اسلامی نظام کے مرکز کے لیے استعمال کیے ہیں اس کے لیے بہت آیات موجود ہیں، جن میں سے چند کے حوالے ہم تحریر کر رہے ہیں۔ آیات نقل کرنے سے مضمون کے طویل ہونے کا خدشہ ہے۔ 58:5,58:20,33:36,59:8,9:62,9:74,80:20,24:54, 8:13,8:46,24:63,9:107 وغیر آیات کریمات۔

یہ حقیقت کہ حضورؐ کی اطاعت روایات کے ذریعے نہیں ہوسکتی بلکہ حضورؐ کی اطاعت صرف اسلامی نظام کے سربراہ کی معرفت ہی ہوسکتی ہے اس کے لیے دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم نے اطاعت کے لیے سماعت کو شرط قرار دیا ہے۔ روایات کے ذریعے اطاعت کرنے میں سماعت کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے یہ آیات ملاحظہ فرمائیں۔

(1) اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (24:51) ترجمہ ایمان والوں کی بات یہی تھی کہ جب بلایا جائے ان کو اللہ و رسول کی طرف، ان میں فیصلہ کرنے کو تو وہ کہیں ہم نے سن لیا اور حکم مان لیا اور وہ ہی لوگ ہیں کہ ان کا بھلا ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں سماعت کو اطاعت کی شرط

قرار دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سماعت روایات کے ذریعے نہیں ہوسکتی بلکہ یہ سماعت صرف کسی زندہ اتھارٹی کی ہی ہوسکتی ہے۔

(2) ارشاد گرامی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (8:20) ترجمہ: اے ایمان والوں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے مت پھرو درآں حالے کہ چونکہ تم سن رہے ہو۔

(3) وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (2:285) ترجمہ: اور کہنے لگے اے ہمارے پروردگار ہم نے (تیرا ارشاد) سنا اور مان لیا۔ پروردگار ہمیں تیری مغفرت چاہئے اور تیری ہی طرف لوٹ کے جانا ہے۔

(4) ارشاد فرمایا: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا (64:16) تو جہاں تک تم سے ہوسکے خدا سے ڈرتے رہو اور (اُس کے احکام) سنو اور مانو۔

اللہ و رسول کی اطاعت کے لیے واحد کا صیغہ اور واحد ضمیر استعمال کرنا اور سماعت کو اطاعت کی شرط قرار دینا یہ دونوں امور حقیقت واضح کرتے ہیں کہ اصل مقصود نظام کی اطاعت ہے۔ صرف نظام کی اطاعت سے ہی اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ آج کل کسی جگہ بھی اسلامی نظام قائم نہیں ہے۔ اس لیے اس وقت ساری دنیا میں ایک گز زمین پر بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت نہیں ہو رہی ہے۔ ہم مسلمان صرف پرستش میں منہمک و مصروف ہیں جو اطاعت کا بدل نہیں ہوسکتی۔ جو حضرات دین کے داعی ہیں ان پر لازم ہے کہ وہ اطاعت رسول کے مزعومہ مفہوم کو زیر غور لائیں ورنہ وہ اقامت دین میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکیں گے اور وہ مذہب اور پرستش کے اندر ہی گھومتے رہیں گے۔

یہ بات واضح رہے کہ پرستش ہی ہم مسلمانوں کے اعمال کو ضائع کر رہی ہے۔ سورہ نور میں ارشاد ہوتا ہے طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ط (24:53) طاعت معروف ہوتی ہے جو عمل محسوس سے اپنا تعارف آپ کرا دیتی ہے اسے اپنے تعارف کے لیے کسی قسم کی قسمیں کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی اس سے اگلی آیت میں ارشاد ہے قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ج (24:54) ان سے کہو تم اطاعت کرو، اللہ کی اور اس کے رسول کی، تو اس اطاعت کا معروف ہونا یہ ہوگا کہ تمہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا۔ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55) ہم انہیں اس زمین میں اقتدار دے دیں گے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ اطاعت اس طرح معروف ہوتی ہے کہ اس سے اقتدار حاصل ہوجاتا ہے۔ یہ بات پرستش سے نہیں ہوسکتی۔ قرآنِ کریم کی رُو سے اسلامی مملکت ایمان اور اعمال صالحہ کے ذریعے قائم ہوتی ہے۔ دنیاوی حکومتیں تشدد، زور، قوت، طاقت اور دہشت گردی کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں لیکن اسلامی مملکت صرف ایمان اور اعمال صالحہ کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ یہ مملکت بندوق کی نوک کا نتیجہ نہیں ہوسکتی۔ اعمال صالحہ کے ذریعے ملک حاصل ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط (24:55) اور (اللہ) ان کے خوف کو امن میں تبدیل کر دیگا۔ قرآنِ کریم کا

تو مقصد ہی اس دنیا میں خدا کی بادشاہت کے ذریعے ساری انسانیت کے لیے امن وامان قائم کرنا ہے اور یہ سب کچھ اعمال صالحہ کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔ فرمایا: قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (5:15-16) (اے اہل کتاب) اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی اور ایسی کتاب آئی ہے جو روشن ہے۔ خدا اس کتاب کے ذریعے ان لوگوں پر جو اس کی رضا کے تابع ہوا، سلامتی کی راہیں نکال دیتا ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہوا کہ قرآنِ کریم کی اطاعت انسانیت کو دارالسلام کی منزل تک لے جاتی ہے۔ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (6:127) ترجمہ: ان لوگوں کے لیے (جو قرآن کی راہ پر چلے) ان کے پروردگار کے پاس امن وامان کا گھر ہے اور وہ اللہ ان کے اعمال صالحہ کی وجہ سے ان کا مددگار ہے۔ اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ امن وسلامتی کی ہی دعوت دیتا ہے وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (10:25) اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف دعوت دیتا ہے۔ جو چاہتا ہے اسے کامیابی کی سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔ مومنین کے تمام افکار اور ان کی تمام جدوجہد کا مقصد ہی سلامتی والی جنت ہے اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ؕ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ (15:45-46) بلاشبہ متقی حضرات باغوں اور چشموں میں ہوں گے (اُن سے کہا جائے گا) سلامتی کے ساتھ بہ اطمنان ان باغوں میں داخل ہو جاؤ۔

انسانیت اپنے اجتماعات کے نظام وضع کرتی چلی آرہی ہے جس میں ہر نظام کو بزورِ قوت قائم کیا گیا تھا۔ لیکن قرآنِ کریم فرماتا ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ؕ (35:10) انسان کے اعمال صالحہ، اس کو سہارا دے کر اس کو قائم کرتے ہیں۔ قرآن کریم واضح کر رہا ہے کہ اسلامی نظام صرف اعمال صالحہ کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ وہ اس آیت میں خود عمل صالح کو Define کر رہا ہے کہ ہر وہ عمل جو اسلامی نظام قائم کرتا ہے، اور اس کو قائم رکھنے میں مدد دیتا ہے وہ عمل صالح ہے۔ اس کے علاوہ پرستش کی رسوم اعمال صالحہ میں شامل نہیں ہوسکتیں حضور کے مکی دور میں روزہ، زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی تھی یہ مدینہ میں فرض ہوئی۔ نماز بھی ہجرت سے چند ماہ قبل معراج شریف میں فرض ہوئی ہے۔ لیکن مکی دور میں اعمال صالحہ کا حکم موجود ہے۔ ان اعمال صالحہ سے پرستش کی رسوم مراد نہیں ہوسکتیں بلکہ یہ وہ ہی اعمال صالحہ ہیں جو اسلامی مملکت کو قائم کرنے کے لیے کئے جارہے تھے۔

یہ بات واضح ہے کہ قرآنِ کریم میں روح خداوندی کا ذکر موجود ہے لیکن سارے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی روح انسانی کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے انسان میں روح نفخ کردی (38:72, 15:29) تو پھر قرآن نے اس روحِ خداوندی کو نفس انسانی کے نام سے پکارا ہے اور روح کا لفظ ترک کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو وہ ساری صلاحیتیں عطا فرما دیں جو اس کی صفات حسنہ ہیں۔ نفس انسانی کو یہ ساری صلاحیتیں خوابیدہ (Dorment) صورت میں ملتی ہیں اور ہر انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرے۔ ذاتِ خداوندی ایک مکمل ترین

ذات ہے۔ وہ انسانوں کے لیے ایک ماڈل ہے۔ ان صفات کو سامنے رکھ کر ہر شخص ان صفات کو اجاگر کرتا ہے اور اس طرح قرب خداوندی حاصل ہوتا ہے۔ انسان میں اللہ تعالیٰ کی یہ صفات صرف اسلامی مملکت میں ہی Develop ہوسکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ رازق ہے تو ہر شخص کو دوسروں کی ربوبیت کرنی چاہئے اللہ تعالیٰ کریم ورحیم ہے۔ ہر شخص کو دوسروں کے لیے کریم ورحیم ہونا چاہئے اُمت مسلمہ میں بھی بحیثیت مجموعی یہ صفات بیدار ہونی چاہئیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب سب مسلمان ان صفات کے حامل ہوں گے تو اُمت مسلمہ ازخود ان صفات کی حامل ہوگی۔ اسلامی مملکت کی اساس بھی صفات خداوندی پر استوار ہوتی ہے۔ ہر اسلامی مملکت کو رزق فراہم کرنا ضروری ہے۔ یہ مملکت اپنے تمام شہریوں کی ربوبیت کرتی ہے۔ ہم صفات خداوندی پر ایمان لاتے ہیں، ہمارا یہ ایمان ایک نظری اور فکری ایمان ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی مملکت وہ اجتماعی نظام ہوتا ہے جس میں صفات خداوندی اس دنیا میں ٹھوس شکل اختیار کرکے، آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں صفات خداوندی یا دوسرے الفاظ میں مستقل اقدار اور انسان کی مثالی فطرت آپس میں ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس مملکت میں اس کے ہر شہری کی تمام مضمر صلاحیتوں کی ازخود نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ قرآن کریم کے مطابق یہ معاشرہ قابل حمد وستائش بھی ہوتا ہے۔ (17:79)

ہم نے اپنے ایک مضمون بعنوان ''استدراک'' میں جو نومبر 2014ء کے رسالہ طلوع اسلام کے ایشو میں طبع ہوا تھا۔ اس میں صفاتِ خداوندی اور اسلامی ریاست کا باہمی تعلق واضح کیا تھا۔ وہ اقتباس اگرچہ ذرا طویل ہے، لیکن یہ صفات خداوندی کو ریاست سے Relate کرتا ہے آپ ملاحظہ فرمائیں۔

''البتہ اب ہم ان صفات کو ریاست سے Relate کرتے ہیں کہ اُن صفات کا اسلامی ریاست سے کیا تعلق ہوتا ہے، اسلامی ریاست کی اساس صفات خداوندی پر ہوتی ہے۔ یہی مستقل اقدار ہوتی ہیں، اور (Political Parlance) میں یہی حقوق انسانی ہوتے ہیں۔ ہر اسلامی ریاست کو عادل، رازق، حکیم، علیم، خبیر، قوی، عزیز، رحیم وغیرہ ہونا چاہئے۔ میری ذات کا بھی یہ تقاضہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے عدل، علم، صبر، سماعت، بصارت وغیرہ سے کام لوں۔ میں جب ریاست کے اس فیصلہ کی اطاعت کرتا ہوں جو عدل پر مبنی ہے تو میری یہ اطاعت اس ریاست کی اطاعت نہیں رہتی بلکہ یہ میری ذات کے ایک تقاضہ کی اطاعت اور اس تقاضہ کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ جس طرح پانی پینے سے میں کسی کی اطاعت نہیں کرتا، بلکہ اپنی ذات کا ایک تقاضہ پورا کرتا ہوں۔ اسی طرح جب اسلامی ریاست اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کے تقاضہ کو پورا کرتی ہے تو اس کی اطاعت میری اپنی ذات کی اطاعت ہوتی ہے اور اپنی ذات کا ایک تقاضہ پورا کرنا ہوتا ہے۔ ہم سب اللہ تعالیٰ کی صفات پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کو رازق، عادل، رحیم، کریم، رب مانتے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ عقیدہ مجرد (abstract) صفات پر ہے لیکن جب اسلامی ریاست اللہ تعالیٰ کی صفات کو روبہ عمل لاتی ہے اور رزق فراہم کرتی ہے،

سب کی ربوبیت کرتی ہے، سب کے ساتھ عدل کرتی ہے تو اس طرح صفات خداوندی ایک محسوس، ٹھوس، شکل میں سامنے آجاتی ہیں اور تمثیلاً اور تشبیہاً اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی صفات عالیہ کے ساتھ زمین پر آکر نور فشاں ہوجاتا ہے۔ اسلامی مملکت میں، اس مملکت کی اطاعت سے، انسانی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح انسانی ذات، اور اسلامی معاشرہ کا تزکیہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ جس طرح طبعی قوانین کا علم حاصل ہونے سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح وحی خداوندی کا علم اور مستقل اقدار پر عمل کرنے سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ (11:66) ترجمہ: بیشک تیرا رب وہی ہے قوت اور غلبہ والا۔ جب ان صفات کو منعکس کیا جائے گا تو لازم ہے کہ ریاست قوی اور غلبہ والی ہوگی۔ یہی وہ نظام، ہے جو ظل اللہ فی الارض ہوتا ہے۔ اس نظام کی تعریف کرتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا تھا لقد ترکت علی مثل البیضاء لیلھا ونھارھا سواء۔ میں تم میں وہ ملت بیضا چھوڑ کے جارہا ہوں جس کی رات اس کے دن کی مانند روشن ہے۔ لیکن آج اس بدنصیب قوم کا دن بھی رات کی طرح تاریک ہے۔''

یہ حقیقت بھی ملاحظہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت السلام اور دوسری صفت المومن بھی ہے۔ یہ دونوں صفات جب ہر مسلمان میں موجود ہوں گی، امت مسلمہ میں بحیثیت مجموعی اور اسلامی مملکت بھی ان دونوں صفات کا پیکر ہوگی۔ تو دنیا میں کس طرح ہر طرف امن وسلامتی پھیلی ہوئی ہوگی۔

قرآنِ کریم مسلمانوں کا واحد ضابطۂ حیات ہے وہ خود امن وسلامتی کا سرچشمہ ہے۔ مسلمانوں کی سیاست کا مرکز کعبہ ہے۔ وہ امن وسلامتی کا گہوارہ ہے۔ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ (3:97) جو کعبہ سے جاری شدہ نظام کی حدود میں داخل ہوگیا وہ حفاظت خداوندی میں آگیا۔ قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ جو قوم بھی وحی کے اتباع کرے گی تو اس کا اتباع سے ایسا معاشرہ وجود پذیر ہوتا ہے جس میں کسی قسم کا خوف وحزن نہیں رہتا۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) ترجمہ تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے گی تو جو لوگ میری ہدایت پر چلیں گے ان پر نہ خوف ہوگا اور نہ کوئی حزن، اتباع وحی الٰہی سے ایسا معاشرہ قائم ہوتا ہے کہ اس میں خوف وحزن نہیں ہوتا بلکہ ہر جگہ سلامتی ہی سلامتی ہوتی ہے۔

تحریک طلوع اسلام ایسا ہی معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس عظیم تحریک کا ساتھ دیں اور اس کی مدد فرمائیں۔ یہ تحریک مردہ قوم کو زندہ کرنے والی تحریک ہے۔

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ؕ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ (40:44)

میں تم سے جو بات کہہ رہا ہوں عنقریب ہی تم اسے یاد کروگے اور میں اپنا کام اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔

عطاء الحق قاسمی

ایک بار پھر اقبال!

ہم لوگوں نے پائیدار قدروں اور پائیدار شخصیتوں کو یاد کرنے کے لیے سال میں ایک دن ایک ہفتہ یا ایک مہینہ مخصوص کر رکھا ہے۔ چنانچہ آگے پیچھے ہم ناپائیدار چیزوں کے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں، مثلاً رمضان کا مہینہ ہم نے عبادتوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے، ہم اس مقدس مہینے میں بھی خدا سے ''آڈا'' لگانے سے باز نہیں آتے اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ برکت کا مہینہ ہے مگر اس مہینے میں چوہدری برکت اپنے منافع میں چار گنا برکت ڈال دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس مہینے میں شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے مگر ہم میں سے کئی لوگ اس مبارک مہینہ کی آمد سے پہلے شیطان کو انڈوں پر بٹھا دیتے ہیں۔ پھر ان انڈوں سے نکلنے والے شیطان کے بچے سارا مہینہ اودھم مچاتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا ہم ہفتہ دیانت اور ہفتہ خوش اخلاقی بھی منایا کرتے تھے، ہفتہ دیانت میں خوش اخلاقی کو قریب نہیں پھٹکنے دیتے تھے اور ہفتہ خوش اخلاقی کے دوران دیانت کا داخلہ بند کر دیا جاتا تھا۔ مغرب میں ایک دن یوم والدین منایا جاتا ہے۔ اس روز والدین کو دو ڈالر کا ایک کارڈ بھیج کر باقی عرصے کے لیے انہیں ڈمپ کر دیا جاتا ہے۔ ایک دن ''یوم محبوبہ'' کے حوالے سے مخصوص ہے جسے ویلنٹائن ڈے بھی کہا جاتا ہے اور جواب ہمارے ہاں مغرب سے زیادہ جوش وخروش سے منایا جانے لگا ہے۔ اس روز محبوب کو ''لارے'' دیئے جاتے ہیں اور اگلے روز کسی نئے محبوب کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ ہم تو پنج وقتہ نماز میں بھی اللہ جانے کسے چکر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان نمازوں کے دوران اپنے کسی کام کے لیے کسی دنیاوی ''بڑے'' کی سفارش بھی تلاش کر رہے ہوتے ہیں خواہ وہ بڑا اللہ کا باغی ہی کیوں نہ ہو۔ ہم کہتے ہیں ''سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں'' مگر ہمارے قلم اور ہماری زبان سے جھوٹے خداؤں کی تعریفیں ادا ہونے کے لیے مچل رہی ہوتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی کو مدد کے لیے پکارتے ہیں'' مگر ہم مدد کے لیے انہی کی راہ دیکھتے ہیں جن کی ''عبادت'' گزشتہ 68 برسوں سے ہم پورے خضوع وخشوع کے ساتھ کر رہے ہیں! ہم خدا سے کہتے ہیں'' ہمیں سیدھا راستہ دکھا، ان کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، ان کا راستہ نہیں جو تیرے مغضوب ہیں'' مگر ہم سلام پھیرتے ہی مغضوبین کے راستے پر کھنچے چلے جاتے ہیں۔ دراصل ہمیں یہی راستے محبوب ہیں چنانچہ ہم نفسانی خواہشات کا احرام باندھے لبیک کا ورد کرتے ہوئے ان راستوں کے طواف میں لگے رہتے ہیں۔ ہم اپنی منزل مدینہ بتاتے ہیں اور ہر دفعہ کوفے کی طرف جا نکلتے ہیں۔ اقبال نے ہم ایسے لوگوں کی ہم ایسی نمازوں اور ہم ایسے ''اماموں'' ہی کے لیے کہا تھا ؎

تیری نماز بے سرور، تیرا امام بے حضور
ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر

باقی جہاں تک اقبال کا تعلق ہے ہم نے اپنے اس نابغہ کو یاد کرنے کے لیے بھی سال میں دو دن مخصوص کیے ہوئے ہیں، ایک اس کے یوم ولادت پر اور دوسرا اس کے یوم وفات پر! مگر اصل صورتحال یہ ہے کہ ہمارے حکمران اور ہماری اشرافیہ، عظمتِ انسان کے علمبردار اور مذہب کی مثبت تشریح پیش کرنے والے اس سب سے بڑے شاعر کی تعلیمات کی وفات روزانہ بڑے اہتمام سے مناتی ہے جبکہ میں زندگی کے تمام شعبوں میں اقبال کے ''یوم ولادت'' کا منتظر ہوں! اقبال وہ واحد شاعر اور واحد مفکر ہے جو مذہب کو افیون قرار دینے والوں کی تردید انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں مذہب کے فعال پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی صورت میں کرتا ہے۔ وہ تو اس تصوف کے بھی خلاف ہے جو انسانوں کو خدا سے ملانے کی بجائے انہیں قصہ کہانیوں میں الجھا کر رکھ دے جبکہ اقبال کا اسلام نئی دنیائیں اور نئے صبح وشام پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ ستاروں سے آگے آباد جہانوں کی نشاندہی کرنے والا شاعر ہے۔ وہ تو عالم انسانیت کی زبوں حالی پر خدا سے بھی الجھ پڑتا ہے ؎

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی
فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

یہ شاعری صرف آدم اور خدا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کے حوالے سے اہم نہیں ہے بلکہ یہ ان فتویٰ بازوں کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہے جنہوں نے آزادیِ فکر کا گلا گھونٹنے کے لیے ہماری فکر کی قینچیوں کے کالر اتنے تنگ کر دیئے ہیں کہ نئی نسل کے حلق سے ''صدائے لا الٰہ'' بھی نہیں نکلتی! مگر آج مجھے صرف وہ شاعر اور مفکر یاد نہیں آرہا جس نے اپنے خطبات میں جدید دور کے تمام مسائل پر سیر حاصل گفتگو کی۔ جس کی شاعری نے فرنگی ایوانوں میں ہلچل مچادی، جس کے تصور اور جس کے کلام کے زیر اثر قیامِ پاکستان عمل میں آیا اور دنیا کے بہت سے مسلمان ملکوں میں آزادی کی تحریکیں چلیں، جس نے سرمایہ داری نظام پر کاری ضرب لگائی، جس نے اس کھیت کو آگ لگانے کی بات کی جس کھیت سے دہقاں کو روزی میسر نہ آتی ہو، بلکہ آج خصوصی طور پر مجھے وہ اقبال یاد آرہا ہے جس نے خدا سے شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا ؎

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں، تو بھی تو ہر جائی ہے

اقبال ٹھیک کہتا ہے کہ

اغیار کے کاشانوں پر رحمتیں ہی رحمتیں ہیں مگر کیا کہا جائے، اللہ تعالیٰ نے تو قوموں کی ترقی اور زوال کے اصول سب

کے لیے ایک سے رکھے ہوئے ہیں۔

سبق پڑھ پھر صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

جو قومیں بھی ان اصولوں پر عمل پیرا ہیں۔ وہ دنیا کی امامت کر رہی ہیں، کبھی یہ اصول ہمیں عزیز تھے، اس وقت ساری دنیا ہماری مقتدی تھی مگر اب اس منزل میں جہاں بہت سے اسٹاپ آتے ہیں۔ وہاں وہ لوگ بھی کٹ مار کر ہماری رہنمائی کرنے لگتے ہیں جن کا کام رہنمائی نہیں عوام کے منتخب رہنماؤں کی پیروی کرنا ہوتا ہے اور ہمارے کچھ اہل قلم ان کی راہ تکتے اور ان کے لیے رستہ صاف کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس صورتحال میں ہم خدا سے کیا گلہ کریں اور کس منہ سے ناخدا سے شکوہ کریں؟

(بشکریہ: روزنامہ جنگ، لاہور، 23 نومبر 2015ء)

معزز صارف!

محکمہ ڈاک 1892ء سے لیکر آج تک اس خطے میں آپ کی خدمت کے لئے کوشاں ہے۔ ماضی میں ہر مشکل وقت میں محکمہ ڈاک نے عوام الناس کی بے پناہ خدمت کی ہے اور اُسی جذبہ کو برقرار رکھتے ہوئے ہم آپ کی مزید خدمت کرنا چاہتے ہیں موجودہ دور میں محکمہ ڈاک کو بڑے چیلنجز کا سامنا ہے۔ اس تناظر میں محکمہ ڈاک نے آپ کی خدمت کے لیے اپنا دائرہ کار وسیع کیا ہے۔ اب آپ:

- بجلی، گیس، پانی اور ٹیلی فون کے بل اپنے قریب ترین ڈاکخانہ میں جمع کرا سکتے ہیں۔
- اپنے پیاروں کے بیرونِ ملک سے بھیجے گئے پیسے ویسٹرن یونین کے ذریعے مقرر کردہ ڈاکخانوں سے وصول کیے جا سکتے ہیں۔
- رقم کی منتقلی اب برقی اور فیکس منی آرڈر کے ذریعے فوری طور پر ممکن ہے۔
- ارجنٹ میل سروس کے ذریعے اپنی ڈاک پورے ملک میں پہنچائیں۔
- وی۔ پی۔ پارسل/ لیٹر کے ذریعے اپنے کاروبار کو مزید مستحکم کر سکتے ہیں۔
- اپنی پوری عمر کی جمع پونجی اور بچت قریب ترین ڈاکخانے میں سیونگ بنک میں جمع کروا سکتے ہیں۔
- آپ سے التماس ہے کہ آپ قریب ترین ڈاکخانہ میں تشریف لا کر خدمت کا موقع دیں۔

شکایات کے ازالے کے لیے مندرجہ ذیل فون نمبرز پر صبح 09:00 بجے سے شام 08:00 بجے تک رابطہ کر سکتے ہیں۔

Ph:042-99210971, 042-99239794 Cell:0321-6772525, 0335-6161400
Fax: 042-99211323 Email: ccpmgpunjab@yahoo.com

نوٹ: یہ اشتہار محکمہ ڈاک پنجاب کی طرف سے دیا جا رہا ہے۔

آپ کے تعاون کے لیے شکر گزار محکمہ ڈاک

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

باب المراسلات

سوال: آپ بار بار اعادہ کئے جا رہے ہیں کہ دو قومی نظریہ پاکستان بجز اِس کے نہیں کہ ایک علیحدہ ریاست کے مطالبہ سے کہ جس میں قرآن کے مستقل اور غیر مُتبدل اصولوں کی حدود کے تحت اللہ کی حاکمیت کے عملی نظام کو نافذ کیا جانا سمجھا جائے آپ کے موقف کے برعکس مُلک کی متعدد مُقتدر شخصیتوں کا موقف بھی سامنے آ رہا ہے کہ بانیانِ پاکستان نے کبھی اسلامی شریعت کا ذکر تک نہیں کیا، لہٰذا پاکستان کو مذہبی طبقے یونہی اسلام سے منسوب کر رہے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ پاکستان سیکولرزم اور مغربی جمہوریت کے لبرل اصولوں پر مبنی ریاست کے قیام ہی سے اپنے وجود کو قائم رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا ہمیں آپ سے وضاحت درکار ہے کہ:

1۔ کیا بانیانِ پاکستان نے اسلامی شریعت کا ذکر کیا تھا اور اگر نہیں تو کیوں نہیں؟

2۔ کیا نظریہ پاکستان میں سیکولرزم نظام کی گنجائش ہے؟

3۔ کیا نظریہ پاکستان مغربی جمہوریت کے مشاورتی نظام کے حق میں ہے؟

جواب:۔

آپ کے پہلے سوال کا جواب ہے کہ بانیانِ پاکستان نے اللہ کی حاکمیت پر مبنی اسلامی نظام میں شریعت کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کیوں نہیں کیا تھا تو یہ ایک تفصیلی وضاحت کا مُتقاضی ہے۔ آغاز ہی میں بہتر ہوگا کہ اللہ کی حاکمیت پر مبنی اسلامی نظام کا بانیانِ پاکستان کے موقف کا تجزیہ کیا جائے۔

لہٰذا یہاں سرسید احمد خانؒ، علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا مؤقف پیش کیا جاتا ہے۔ جنہیں بالترتیب پاکستان کا معمارِ اوّل مصورِ پاکستان اور بانیٔ پاکستان خیال کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے یہ موقف قرآن سے ہی اخذ کیا تھا اور اِس بنا پر نظریہ پاکستان، قرآن کے موقف ہی کی ترجمانی کرتا ہے۔

سرسید احمد خاں کا موقف:

سرسید احمد خان نے قانون سازی میں قرآن ہی کی حیثیت کو الحق اور مستند خیال کرنے میں اپنا واضح موقف اپنی تفسیر القرآن میں بیان کیا کہ:

''میرے نزدیک نہ کوئی کتاب خدا کی کتاب کے سوا غلطی سے پاک ہے'' خواہ کیسی ہی اصح الکتب نہ سمجھی گئی ہو۔ اس

لئے احادیث کی کتب میں دیئے گئے اقوال کو اقوال رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی الحق کا درجہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ منسوب الی الرسول ہی کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔''

وہ مزید فرماتے ہیں کہ ہم کو ضرور ہے صرف الفاظِ قرآن مجید کے پابند رہیں۔

اُنہوں نے قوم سے مخاطب ہو کر اعلان کیا:

جو چیز چاہے کر کے دیکھ لو، جب تک تم پھر سے اُس کتاب عظیم (قرآن) کو اپنا راہنمائے حیات نہیں بناتے، زمانے میں اپنا مقام نہیں پا سکو گے۔

اِس واضح اور دوٹوک موقف کے بعد قائداعظم کا موقف سامنے لایا جاتا ہے۔

قائدِاعظم کا دوقومی نظریہ پاکستان کو بطور نظریہ قرآن کرنا:

قائداعظم نے واضح طور پر دوقومی نظریہ کے تحت قرآنی ہدایت کے مطابق، اسلامی حکومت کے قیام کی وضاحت 19 اگست 1941ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کو (بحوالہ روزنامہ انقلاب، مورخہ 8 جنوری 1942ء) انٹرویو دیتے وقت یوں کی کہ:

"It is the Quranic Provision which determine the limits of our freedom and restrictions in political and social spheres. In other words Islamic State is an agency for enforcement of Quranic principles and injunctions"

''قرآن کے احکام ہی سیاست اور معاشرت میں، ہماری آزادی اور پابندیوں کی حدود متعین کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں، اسلامی حکومت قرآنی اصول واحکام کی حکمرانی کے لئے ایک ایجنسی ہے۔''

علامہ اقبال کا موقف:

علامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں اپنے موقف کی اپنے اسی ایک شعر میں بات کر کے مزید وضاحت کی ضرورت ہی نہیں رہنے دی۔

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جُز بہ قرآن زیستن

یعنی اگر تم مسلمان کی زندگی گزارنے کے خواہش مند ہو (جیسا کہ مطالبہ پاکستان میں ہمارا دعویٰ تھا) تو قرآن کی ہدایت سے باہر زندگی گزارنے کا خیال ہی ناممکن ہے۔ یہی ہدایات پاکستان کے دستور میں بھی ہیں۔

دستور پاکستان میں بیان کردہ نظریہ پاکستان کا مفہوم:

To put in the words of Constitution under Preamble, it is stated there in "where as sovereignty of the entire universe belongs to almighty Allah alone, and the

authority to be exercised by the people of the Pakistan with in the limits prescribed by Him is a sacred trust"

پوری کائنات میں حاکمیت اعلیٰ رب کریم کی ہے اور حکومت جو بھی ہو، اُس میں پاکستان کے عوام ایک مُتبرک ٹرسٹ کے طور پر حاکمانہ اقتدار کو اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود کے اندر استعمال کرے گی۔

دستور میں دی گئی اس وضاحت سے نظریہِ پاکستان کا مفہوم یوں سامنے لایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ حدود متعین کر دی ہیں اور انسانوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے اختیارات جس طرح جی چاہے استعمال نہیں کر سکتے بلکہ انہیں چاہیے کہ وہ اپنے اختیارات کا استعمال ان حدود کے اندر کریں۔ یہ حدود انسانی عقل کے تراشیدہ نہیں ہیں اور نہ ہی انسانی عقل ان کو متعین کر سکتی تھی۔ یہ وحی کے ذریعہ خدا کی طرف سے متعین کردہ حدود ہیں جو قرآنِ کریم کے اندر واضح طور پر مکتوب و محفوظ ہیں۔ یہ حدود ناقابلِ تغیّر و تبدل ہیں۔

دنیا میں جو قوم اپنے اختیارات کو ان حدود و قیود کے ماتحت استعمال کرتی ہے وہ اسلامی مملکت کی علمبردار کہلاتی ہے۔ جو جماعت اپنے اختیارات کو ان حدود و قیود کے مطابق استعمال نہیں کرتی بلکہ اپنی مصلحت کوشیوں کے ماتحت صرف کرتی ہے وہ غیر اسلامی کہلاتی ہے۔ اسے ہی نظریہ اسلام کہتے ہیں اور اسی بنا پر دو قومی نظریہ نظریہ پاکستان بھی کہلاتا ہے۔

بانیانِ پاکستان کا دوٹوک موقف ہمارے سامنے آچکا کہ نظریہ پاکستان کے فہم، اور اُس کے مطابق عملی طور پر اسلامی حکومت کے قیام کے لئے قرآن ہی سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ یہی رہنمائی صحیح اقدام کی نشاندہی کرتی ہے، جس میں کوئی اختلاف و تضاد نہیں اور اگر اس سے روگردانی کی جائے، تو اختلافات اور اعتراضات کا باعث بنتی ہے۔

بانیانِ پاکستان پر شریعت کے نام کو نظر انداز کرنے کا الزام:

شریعت کو بانیانِ پاکستان کے نظر انداز کرنے کے ضمن میں مُلک کی مقتدر ہستیوں کا اعتراض بادی النظر میں وزن رکھتا ہے اور پڑھے لکھے طبقہ میں اہمیت رکھنے کی بنا پر تفصیل سے تجزیہ کا مُتقاضی ہے۔ مُقتدر ہستیوں نے اعتراض کرتے وقت اپنی دلیل میں واضح نہیں کیا کہ وہ شریعت سے کیا مطلب اخذ کر رہے ہیں۔ وہ بات تو بانیانِ پاکستان کے حوالے سے کر رہے ہیں۔ لیکن قرائن سے البتہ یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ یہاں روایتی شریعت کا ہی حوالہ دے رہے ہیں۔

لہٰذا مکتبِ مُلا اور بانیانِ پاکستان کے شریعت کے دونوں طرف سے دیئے گئے مفہوم کو مستند ترین حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اِسی کو ملحوظِ نگاہ نہ رکھنے سے اُمت میں نظریہ پاکستان پر تابڑ توڑ حملوں کی یلغار سے مایوسی اور بے یقینی پھیلائی جا رہی ہے۔

شریعت کے لغوی معانی:

اس کے معنی سیدھا راستہ ہے جو واضح اور کُھلا ہو۔ ابن فارس کی مُستند لُغات میں اس کے بنیادی معنی لکھے ہیں کسی چیز کو

طول کی جانب سے کھول دینا کہ وہ یہاں سے وہاں تک پوری کی پوری سامنے آجائے۔

مُقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد کی کشاف اصطلاحاتِ قانون (اسلامی) میں شریعت کو اللہ کے لائے ہوئے احکام اور زندگی گزارنے کا وہ راستہ بتائے ہیں جو دین نے مقرر کیا ہو۔

ہمارے ہاں دین اور شریعت بمعنی مذہب الگ الگ معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ اِس کو سمجھے بغیر فہمِ القرآن کے روائتی تصور سے ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔

شریعت کا اصطلاحی مفہوم:

دین میں شریعت سے مراد، وہ جزئی احکام لئے جاتے ہیں جن پر اُمت کے لئے چلنا ضروری ہوتا ہے۔ اسلام کا نظام یہ ہے کہ اللہ نے قرآن حکیم میں (بجُز چند گھریلو زندگی سے متعلقہ مُستثنیات کے) دین کے صرف اصول دیئے ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنا مقصود ہے۔ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانے کی اُمت اپنے لئے جُزئی احکام (شریعت) اپنے زمانے کے مطابق، باہمی مشورہ سے خود مرتب کرے گی۔ قرآنی اصول غیر مُتبدل رہینگے اور یہ جُزئی احکام تبدیل ہوتے رہینگے۔ ان احکام کو شریعت کہا جاتا ہے اور یہ بدلتی رہیگی اور اصولِ شریعت غیر مُتبدل رہینگے۔ لہٰذا شریعت وہ ہوگی جس میں جمود، تعطل نہ ہو۔ جس میں تسلسل ہو۔ شریعت کا یہ تصور علامہ اقبالؒ کی تحریروں اور قائداعظمؒ کے خُطبات میں سے بھی بنیادی طور پر قرآن سے اخذ کرکے بیان ہوئے ہیں۔

اس کے برعکس ہمارے مکتبِ مُلا کے ہاں ابھی تک یہ قریب قریب مُتفقہ عقیدہ ہے کہ ایک اسلامی حکومت کو جس قدر قوانین کی ضرورت ہے، وہ سب کے سب ہماری ایک ہزار سال سے مرتب فقہ (مذاہبِ) اربعہ (مالکی، حنفی، شافعی اور حنبلی) کے اندر آچکے ہیں اور ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں ہوسکتا۔ اسے وہ شریعت کا نام دیتے ہیں جو اب ناقابلِ تبدل ہے۔ وہ سبھی مُتفق ہیں کہ اس دور اور آئندہ کے دور میں مملکت کا فریضہ قانون سازی نہیں رہا۔ اس کا کام اب صرف یہ رہ گیا ہے کہ جو سوال سامنے آجائے، اس کے متعلق علماء فقہ سے اُن کے مرتب شدہ ہزار سال پہلے کے فقہی حوالے سے فیصلہ دریافت کرلیا جائے اور اس کے بعد اس فیصلہ کو من وعن نافذ کردیا جائے۔

قائداعظم نے روایتی مذہبی شریعت سے اجتناب کرنے کی وضاحت بھی اُوپر دیئے گئے انٹرویو میں کردی، جب اُن سے پوچھا گیا کہ

سوال:۔ جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار دونوں میں بہترین اور برترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں اور اجمالاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خودمختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی میلانات اور تصورات زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور روبہ ترقی لاسکیں۔ تو پھر اس میں کونسا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے

ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر وتشریح کردے؟

جواب:۔

''(دِقت یہ ہے کہ) جب اس جدوجہد کو مذہب (شریعت) سے تعبیر کریں تو ہمارے علماء کی ایک (میری نظر میں بہت بھاری اکثریت) جماعت، غیر اس کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیمِ عمل اور اس کے اصل حدود کیا ہیں، ان امور کو چند مولویوں کا اعادہ خیال کر لیتی ہے۔ اور (اپنے حلقہ سے باہر) اہلیت ومستعدی کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی کسی اور میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے انہیں مَیں ان مولوی صاحبان میں نہیں پاتا۔ (اور مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔''

علامہ اقبال نے اس جامد شریعت کے تصور کو یکسر مسترد کرتے ہوئے اس میں جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق ترامیم کرنے کی فوری ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے اپنا موقف یوں بیان کیا۔

شریعت کے متعلق، علامہ اقبال کا موقف:۔

علامہ اقبال نے اپنے چوتھے خُطبہ میں شریعت کی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کُلی کی روحانی اساس ازلی وابدی ہے، لیکن اس کی نمود، تغیر وتنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مُطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر مُتشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق وتوافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم وضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ لیکن ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے اندر تغیر کا امکان ہی نہیں۔ تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقعہ ہوئی ہے، یکسر جامد ومتصلب ہو جائے گی۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''مجھے اس بات کا علم ہے کہ عُلماء اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور فقہی مذاہب اپنی اپنی جگہ مکمل اور مُختم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مُطلق کے امکان سے انہیں کبھی انکار نہیں ہوا۔ (مَیں یہاں وضاحت کرنا چاہوں گا کہ اکابرین نے اس کے لئے ایسی شرائط لگا دی ہیں، جن کو پورا نہ کیا جا سکے۔)۔ مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مُشکلات کا حل تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہنمائی لے سکتے ہیں، لیکن اسلاف کے فیصلے اُن کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔''

اب ہم آپ کے دوسرے سوال سیکولرزم کے جواب کی طرف آتے ہیں۔

سیکولرزم اور نظریہ پاکستان:

نظریہ پاکستان کے بارے میں منیر صاحب (ریٹائرڈ) چیف جسٹس آف پاکستان نے اپنی کتاب From Jinnah to Zia کے دوسرے ایڈیشن میں فرمایا ہے کہ قائداعظم پاکستان میں سیکولر سٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے۔ سیکولر کا لفظ شاید ہمارے کچھ احباب کے لئے غیر مانوس ہو۔ لہٰذا میں چاہوں گا کہ اس اصطلاح کا بھی علمی مفہوم سامنے لایا جائے۔ علم میں سیکولر (عصری) سے مراد ہے کہ:

(1) لاطینی زبان میں لغوی طور پر جس کا تعلق وقت (تاریخ)، قبیلہ، نسل یا امور عالم سے ہو۔

(2) ایسے امور جن کا تعلق عصری زندگی سے ہو۔ سماجی امور و معاملات بمقابلہ پروہتانہ یا کلیسائی امور انتظامی۔

(3) وہ امور مثلاً تعلیم، اخلاق اور شہری یا مملکتی نظم و نسق جو کلیسائی انتظامیہ سے آزاد سمجھے جائیں۔

(4) ارض بمقابلہ ماورائی اور روحانی۔

(5) عام معنوں میں خلافِ دین

سیکولرزم کی اصطلاح کے مفہوم سمجھنے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اسلامی فکر کے سکالر مولانا وحید احمد خان نے نظریاتی سیکولرزم کو علیحدہ کر کے عملی سیکولرزم کی اصطلاح کا مفہوم مولانا سعید اکبر آبادی کے حوالے سے لیا ہے کہ:

''عملی سیکولرزم صرف اس کا نام ہے کہ حکومت کا تعلق مشترک مادی امور سے ہو اور مذہبی معاملات میں وہ عدم مداخلت کی پالیسی پر کاربند رہے۔ کسی مشترک سماج میں یہی واحد قابلِ عمل طریقہ ہے اور آج کے دور میں اِس کا اسلام سے تقاضہ ہے۔''

دنیا کے تقریباً سبھی ملکوں کا نظام اسی کے مطابق چلایا جا رہا ہے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے سیکولر کی تعریف یہ کی ہے کہ جس میں تمام مذاہب آزاد ہوں اور ریاست کے ہر شخص کو یکساں شہری حقوق حاصل ہوں۔ انہوں نے ہندوستان کے حوالے سے لکھا کہ یہاں سب سے بہتر اور قابل عمل نظام صرف سیکولر نظام ہے۔

یہ ایک مجتہدانہ رائے ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سیکولرزم بجائے خود کوئی آئیڈیل نظام حکومت ہے۔ اس کی اصل اہمیت یہ ہے کہ مشترک سماج جیسے ہندوستان ایک غیر اسلامی مُلک میں سیکولر نظام ہی قابل عمل ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت عملی اعتبار سے ہے نہ کہ خالص نظریاتی اعتبار سے۔ اگر عملی سیکولرزم کو صرف شخصی قوانین کی آزادی تک محدود کر دیا جائے، تو موجودہ دور میں یہ آزادی بشمول پاکستان سبھی ممالک میں حاصل ہے۔

اصل مسئلہ یہ نہیں بلکہ عام طور پر نظریہ سیکولرزم کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ انسانوں کی دنیا کے اندر خدا کے قوانین کا کوئی دخل نہیں یہ بات نظریہ پاکستان کے خلاف ہے جس کا نعرہ ہی یہ تھا کہ:

پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ

اس میں الہ کے معنی وہ معبود نہیں جس کی مذہب کے دائرے میں پرستش کی جائے، بلکہ وہ صاحبِ اقتدار ہے، جس کے قوانین کی اطاعت ہی اسلام اور نظریہ پاکستان ہے۔ قرآن کی نظر میں اِسکی کسی بھی شِق کا انکار کُفر ہے

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (المائدہ 44:5)

ترجمہ: جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو یہی لوگ کافر ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کچھ حدود متعین کر دیئے ہیں اور انسانوں سے کہہ دیا ہے کہ وہ اپنے اختیارات کا استعمال ان حدود کے اندر کرے۔ یہ حدود انسانی عقل کی تراشیدہ نہیں ہیں۔ نہ ہی انسانی عقل اِن کو متعین کر سکتی تھی۔ یہ خارج سے وحی کے ذریعے قرآن کے اندر واضح طور پر مکتوب و محفوظ اور نا قابل تغیر و تبدل ہیں۔

دنیا میں جو قوم اپنے اختیارات کو اِن حدود و قیود کے ماتحت استعمال کرتی ہیں وہ اسلامی مملکت کی علمبردار کہلاتی ہیں۔ یہی اور صرف یہی نظریہ پاکستان کی اساس ہے۔

سیکولرزم نظام کے حق میں وہ مغربی جمہوریت کو اسلام کے لِبادہ میں پیش کرتے ہیں۔

اب وقت آ گیا ہے کہ آپ کے آخری سوال نظریہ پاکستان اور مغربی جمہوریت کا تجزیہ پیش کیا جائے۔

جمہوریت اور نظریہ پاکستان:

مُقتدر ہستیوں نے اپنے دلائل میں مغربی جمہوریت کا ذکر کرتے ہوئے ثابت کیا کہ عملی طور پر یہاں فیصلے اقلیت کی بجائے اکثریت سے کئے جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس عملی اعتراض کو صرفِ نظر بھی کر دیں تو بھی، اس کے نظریاتی اکثریت کے فیصلوں کے اتباع کو بھی غیر قرآنی پاتے ہیں۔ اکثریت کے فیصلوں کے اتباع کے حق میں خصوصاً جبکہ وہ متفقہ اور تواتر سے ہوں، مکتبِ مُلّا میں بھی قبولیت کے حصول میں جوش و خروش پایا جاتا ہے۔ اُن کی منطق میں لوگوں کی اکثریت کا گمراہی میں جمع ہونا محال ہے۔

دو لفظوں میں بیان کیا جائے تو جمہوریت میں جس بات کا اکثریت فیصلہ سُنا دے اُسے صحیح قرار دیا جاتا ہے۔ جب امریکہ کی پارلیمنٹ نے کثرت رائے سے یہ فیصلہ کر دیا کہ شراب ناجائز ہے تو وہ ناجائز قرار پا گئی اور اس کا استعمال حرام۔ اور جب دوسری مرتبہ وہاں کی آراء کی کثرت اس طرف چلی گئی کہ شراب جائز ہے تو شراب جائز قرار پا گئی اور اسکا استعمال حرام نہ رہا۔

اِس کے برعکس ہم قرآن سے ہدایت حاصل کر رہے ہیں کہ:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط (الانعام 116:6)

ترجمہ: اگر تم لوگوں کی اکثریت کا اتباع شروع کر دو، تو یہ چیز تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر گمراہ کر دے گی۔

علامہ اسلم جیراجپوری نے شاردا ایکٹ کے خلاف ''جس میں نابالغ کی شادی کی ممانعت کا قانون منظور ہوا تھا'' تمام علماء کی اکٹھے ہو کر ایک متفقہ ریلی نکالنے پر ریمارکس دیئے کہ:

''ہماری تاریخ میں اُمت کا یہ المیہ رہا ہے کہ ہمارے علمائے حق جب بھی کبھی متفق ہوئے ہیں، تو ہمیشہ باطل پر ہوئے ہیں۔''

تاریخ اس پر شاہد ہے کہ نوع انسانی کی اکثریت کبھی صحیح راستے پر نہیں رہی اور شاید اسی کے ہی سہارے اسلامی نظامِ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو کر اتنے عرصے تک اقتدار میں رہا۔ قرآن میں ہے کہ:

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰيٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ (یونس 92:10)

ترجمہ: اور بے شک لوگوں کی اکثریت ہماری آیات (حق) سے غافل ہے۔

اور اس لئے قرآن کا ارشاد ہے کہ:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (الاعراف 179:7)

ترجمہ: اور جنوں اور لوگوں کی اکثریت کو تو جہنم میں پائے گا۔

مکتبِ مُلّا کے علاوہ ہمارے روشن خیال سیکولر ذہن بھی مغربی جمہوریت کے اکثریتی فیصلوں کے تانے بانے قرآن کے مشاورتی نظام سے ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان دونوں میں امتیاز کر کے علامہ اقبال نے اُن کا رد اپنے مخصوص انداز میں یوں کیا ہے کہ:

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں

بندوں کو گِنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اِس ضمن میں ہم پہلے ہی قائداعظم کی وضاحت بیان کر چکے ہیں کہ اسلام میں لوگوں کی اکثریت خواہ وہ مغربی جمہوریت کی شکل میں پارلیمان کی ہو اُن کے فیصلوں کو نافذ کرانے کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ENJOY YOUR STAY AT
HOTEL PARKWAY (PVT.) LTD.
NEAR RAILWAY STATION LAHORE
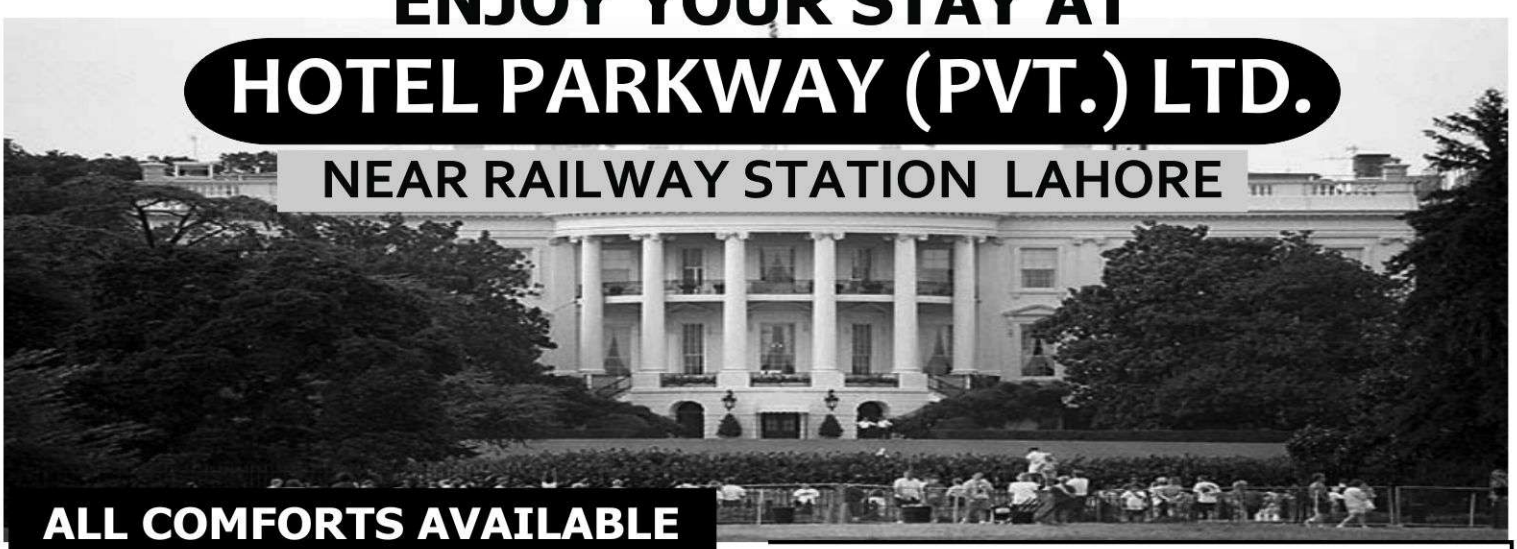
ALL COMFORTS AVAILABLE
❁ T.V. & FAX
❁ AIR-CONDITIONED
❁ TELEPHONE EXCHANGE
❁ CAR PARKING
❁ LIFT, INTERNET
❁ EXCELLENT SERVICE
PH:0092-42-36365908-12, FAX: 0092-42-36311923,
E-mail:hotel_parkway@yahoo.com

Surah *Al-Takwir* (التکویر) – *Durus-al-Qur'an Parah 30*: Chapter 14

By G. A. Parwez

(Translated by: Dr. Mansoor Alam)

My dear friends, today is August 24, 1984 and today's lecture starts with verse 25 of Surah *Al-Takwir* (التکویر). In the last lecture we saw that the Quran – after presenting the natural phenomena as evidence for the truth of its message – said: اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (81:19) – Verily this is the word of a most honorable Messenger. That Our message is reaching to you through *Our* messenger.

Explanation by opposites

It is common practice of the Quran to explain its meaning by opposites. This is a very effective way to clarify meaning. Another benefit of this approach is that it clarifies both the meanings – the synonym and its antonym. For example: light and darkness – if light is explained by its opposite darkness then both become clear. In verse (81:19) it was said that this message has come from the most honorable Messenger. And here the Quran says وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ (81:25) – Nor is this [message] the word of any satanic force accursed [Asad]. It is clear that using this approach of bringing together opposites to explain meaning, we can infer that a message that does not come from Allah's Messenger is from the Satan; that any message that is against the Quran, the revelation of Allah, is from the Satan. There is no need to go into the meaning of Satan as we have discussed such Quranic terms many times before. For the last twenty five years or so that is what I have been doing. Now, please recall what was said in the last lecture. And then in that light see what is being said in the next verse: فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ (81:26) – Whither, then, will you go [Asad]? What a beautiful way to pose this question, my friends? Allah is saying: We explained everything; We provided the most convincing arguments; We provided the most objective evidence; We provided the best logic and the soundest proofs in support of Our arguments for which they do not have any answer – so, now, ask them: why are you knocking at others' doors beside Our door? Why are you going elsewhere besides Us? This is what the Prophet (PBUH) said to his people. This is what all the Prophets (PBUT) told their people. And this is what is being told to us today: Where are you going by leaving Allah's door? We have fashioned hundred other doors where we go. But we are told: فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ (81:26) – Whither, then, are you going? Well, you can go to any other door

besides the Creator's door; you can bow down for help to anyone besides the Almighty Allah. But nothing is going to happen to Allah; nothing will happen to the Quran because: اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (81:27) – This [message] is no less than a reminder to all mankind [Asad]. This Quran is a code of life for all of humanity that will raise the dignity of all humankind. ذِكۡرٌ (Dhikr) means reminder as well as dignity and reverence. So, if you follow Quran's message then you will attain dignity and reverence in the world. If you don't, then some other people will. This is the last message until the Day of Judgment. Whenever any nation will adopt it, it will achieve grandeur and dignity. لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّسۡتَقِيۡمَ (81:28) –to every one of you who wills to walk a straight way [Asad]. Whichever nation wants to follow the straight and balanced path to which the Quran has guided can do so. This idea of choosing right way or the wrong way has been described in many places in the Quran; and I have explained this in great detail; but I would like to explain it again because of its importance.

Whatever type of path, similar will be the type of destination

The essential point of the Quran's teaching is that Allah has endowed human beings with freewill and He has shown them the correct way: اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا (76:3) – Verily, We have shown him the way: [and it rests with him to prove himself] either grateful or ungrateful [Asad]. We have shown the way; and you are standing at the crossroads. Now it is up to you to choose your path. But then your destination will depend on the path you chose. You have the right to choose your path but you do not have the right the change its destination. One can choose one's action but one cannot change the result of that action. Whatever you sow that is what you are going to reap. This is the essence of the entire teaching of the Quran. This is the foundation on which the rest of the teaching of the Quran stands. Human beings are masters of their own freewill: وَقُلِ الۡحَـقُّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ‌ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ‌ (18:29) – And say: "The truth [has now come] from your Sustainer: let, then, him who wills, believe in it, and let him who wills, reject it [Asad]." The entire Quran is full of this message of exercising freewill and making free choice. But when the Muslim kings and dictators took over the reins of power, they brought along their brutal oppression and tyranny. Since they did not have any justification for their oppression, they needed a religious justification for this; and it didn't take long for them to find one. And that justification was the idea of predestination or

kismet or تقدیر (*Taqdir*).

The very first ideology against Islam

After about hundred years after the Prophet (PBUH) and the rightly-guided Khalifas, this period of oppression and tyranny of kings – the *Mulukiyyah*, the worst form of rule of humans over humans – appeared in Islam. The common people rebelled against this tyranny of Muslim kings? They considered the rule of kings as un-Islamic. Well, the religious priesthood came to the defense of kings and it provided the religious justification for their tyranny. It introduced the ideology of predestination or kismet or تقدیر (*Taqdir*) in Islam. This was introduced at the behest of the kings so that they could continue to rule the Muslim population in the name of Islam. This wrong and anti-Islamic ideology was that humans cannot do anything of their own freewill; that everything comes from Allah. Whatever happens, it happens by the Will of Allah: اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (65:12) – God has the power to will anything [Asad]. From this and similar verses it was taken that nothing happens without God's Will; that even a leaf cannot move without His Will. So, this oppression and tyranny that is happening from the kings is happening because of God's Will; otherwise, who are they to cause this? They are only doing what God wants them to do. If they are killing anyone then it is from God's Will; if they are forgiving anyone then it is from God's Will; if they are honoring anyone then it is from God's Will. Why are you blaming them? They are only an instrument of carrying out God's Will. You should not complain about this. You should not even feel bad about it in your heart. Otherwise, it will be a complaint against God because they are only an agent to carrying out His Will. *This* ideology was inserted in Islam which was called the ideology of predestination or تقدیر (*Taqdir*).

The ideology of predestination or تقدیر (*Taqdir*)

My dear friends, as I have mentioned before, the Quran has mentioned only five components of Belief (ایمان *Iman*) which are *Iman* in: Allah; His *Malaaika*; His books; His messengers; and the Hereafter. In the entire Quran these are the only five components mentioned as parts of *Iman*. But *Mulukiyyah* added another component to the Quran's definition of *Iman*, that of belief in predestination: وتؤمن بالقدر خیرہ وشرہ (*Wa Tumin Bilqadr-e Khairihi wa Sharrihi*). This became the sixth component of *Iman* in Islam: that, good or bad, everything happens from God. This is the ideology of تقدیر (*Taqdir* or

predestination) or جبر (*Jabr* or power) that was inserted in Islam by the kings. This has become so common that this is what is written in every Islamic book. This is what is taught to children and repeated ad infinitum so much so that it has gone into our subconscious. So much so in fact, that the masters of our destiny – our political rulers in this world and the custodians of our destiny in the Hereafter (our religious rulers) – openly proclaim that everything happens from God. And when Islam is made like *this* then the entire structure of Quran's teaching comes crashing down. The basis of Quran's teaching is the law of requital – that whatever one sows is whatever one reaps; that one has to face the consequences of ones actions. Good action will produce good results and bad actions will produce bad results. This is the essence of Quran's teaching: The result will be according to the action performed. But, according this inserted ideology of predestination one does not have freedom of action; one cannot do anything from one's own choice, one cannot do anything from one's own freewill, from one's own intention; that one is a horse whose rein is in the hands of the rider and one turns and moves according to the wishes of the rider. And if one asks this "horse" why you turned left, his reply: Ask the rider; ask him who has my rein in his hands. *This* is where the Muslims have been driven to, my friends.

They changed the meaning of the Quran

This ideology of predestination has continued until today among Muslims because the *Mulukiyyah* has continued among Muslims until today; because the oppression and tyranny has continued among Muslims until today. What to do then when the Quran talks about: that Allah has granted human beings freewill and freedom of choice? Well, change its meaning? And that is what was done by religious priesthood. Wherever the Quran talks about: *you* can choose "whatever *you* want – لِمَنْ شَآءَ" change it to "whatever Allah wants." That's it. If Allah wants to send you to Hell or Heaven then it does not matter what you did – you simply go there. In this regard let us see a verse which we went through in our lecture recently: اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (76:29) – Verily, all this is an admonition: whoever, then, so wills, may unto his Sustainer find a way [Asad]. This is a guidance that has been given to you: Use your freewill and choose it and this will take you towards your Sustainer; towards a system that will fulfill your needs for nourishment and development. The next verse

is: وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (76:30). Now before the traditional translation is presented please keep in mind what has been said just in the previous verse (76:29) above; which clearly tells that humans have total freewill and complete freedom of choice. Now let us see the traditional translation of the verse (76:30) – But you cannot will it unless God wills (to show you that way) [Asad]. There is thus this clear contradiction in the translations of these two verses. The translation of verse (76:29) says that you can choose whatever you want using your freewill, but, then, immediately the translation of verse (76:30) says that you cannot will it unless God wills. What to say of this kind of God, my friends!? He has given eyes but you can only see what He wills – then why were these eyes given anyway? Where did the freewill and freedom of choice go then? What happened to the teaching of the Quran that what you sow is what you reap? Or, what happened to accountability? – that you are accountable for your actions; that every action you do produces its consequent result? And then if everything I do is only because God wills it for me to do, then why I should be held accountable for something that I did not choose from my own freewill. And moreover, I am not even allowed to complain about it because it will then be considered a complaint against God? That if you complain then you will be punished twice as much? So, don't say anything and still be punished for something that you had no choice in doing it? Where is the logic in this? God made me do it and then He sends me to Hell? Go figure.

There is no contradiction in the Quran

My dear friends, what have we done to the Quran? – Yes, whoever wants to choose the way of the Sustainer can do so but you cannot wish on your own because you can only wish what God wishes for you? So, even your wish is under God's control. But everyone knows that before any action actually happens, first its intention, its wish, its desire arises in the heart. Heart is the source from where a wish or intention arises, and only then the action occurs. Now if there is control of God over our wish and we cannot wish except that what God wishes for us – i.e., if God wants us to choose the wrong path then we choose the wrong path and act accordingly – but then God says that He will send us to Hell. Then what to say of that God, my friends!? Well, it is clear that this God is the one created by kings. Kings have been called: *Al-Sultan Dillahi 'Ala –al-Ard*" i.e., the king is shadow of God on earth. But actually the king has

made God his shadow. Since these kings were (and are) dictators, oppressors, and purveyors of tyranny about which you cannot open your mouth or complain – so they made God like them, a God like a king.

What kind of God is this? He is super king. He is king of *Mulukiyyah*. He punishes whomever he wants; forgives whoever he wants. Whatever He wants He does. These kings molded God in their image. They made God just like them. You have been given freewill and freedom of choice; but before you exercise your choice first look at his Highness what he wants; and then you only want what he wants. All the verses of the Quran which granted humans free choice are okay; and We say that whatever you wish, it is okay too. But you cannot wish on your own. You cannot wish against Our wish. My dear friends, this has become the standard meaning now. All the verses dealing with human freewill and freedom of choice became subject to this constraint: that humans cannot wish against God's wish. I am not saying this, my friends. Our scholars say this.

What is the meaning of Allah's Will

My dear friends, if we follow the rules of Arabic grammar, then we arrive at a different conclusion; and we feel very rapturous about this. Now let us go back to what the Quran was saying about the freedom of choice: اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (76:29) – Verily, all this is an admonition: whoever, then, so wills, may unto his Sustainer find a way [Asad]. This is a guidance that has been given to you. Use your freewill and choose it. If you do, then this will take you towards your Sustainer; towards a system that will fulfill your needs for nourishment and development. If that is the case then: وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ (76:30) – you wish only what Allah wants. Allah wants that you chose the right path; that it is better for you if you align your wish with Allah's wish. Allah has given the freedom of choice to all human beings and it is up to them to choose what Allah wants or to go against His wish. But Allah wants them to choose the right path; to choose الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (*Siraat-al-Mustaqim*) because this is the path of خیر (*Khair* of Good). So, it is in their best interests to wish what Allah wants them to wish but they can go against His wish if they so choose to do. If you ponder on the words the Quran has chosen for this then you will feel rapturous.

You should wish want Allah wants you to wish

My dear friends, the Quran says: اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ (76:29) – It is a clear reality that is presented to human beings. This is a clear reminder and guidance for human

progress and development, so whoever wants: فَمَنْ شَآءَ (76:29) – let him choose the path that goes towards the Sustainer Allah: اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (76:29). Please note that the Quran says – مَن شَاء (*Man-Shaa-a*) which means whatever you want to wish you are free to wish. Then why don't you wish which We wish? وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (76:30). Now, all that remains for you is to find out what Our Wish is. Well, Our Wish is – that We want *Iman* from you; that We want you to follow the right path which is mentioned in many places in Our book for your convenience. In the very first page; in fact in the very first chapter of Our Book, We have mentioned Our Wish for you: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (1:5) – Guide us along the straight way. This is Our Wish for you. Our Wish is that you should choose *Our* way for *your* own benefit. But We don't want to force you to accept Our Wish; you are free to choose any other way. So, Allah is the One that we must be attracted to; that we should accept His way out of love, not out of force or pressure as it happens with *Mulukiyyah*, as it happens with kings or any other man-made system. If you accept Our way out of love then you will reach the correct destination and your wish will become aligned with Our Wish. Then Allah will be happy with you; then He will congratulate you on your correct choice; and then you will become loved ones in His eyes. What a beautiful style of Arabic language has been chosen here by Allah!? *This* is the true meaning according to the Arabic language. This is according to the standard Arabic grammar and meaning. I have written the meaning of وَمَا تَشَآءُوْنَ (*Ma Tashaa-oon*) in detail in my *Lughat-ul-Quran*. Now, the matter became absolutely clear. The *Malukiyyah* in the middle has been completely removed: Do not wish what these kings want; do not wish what those sitting on chairs of authority want. On the contrary, you wish what Allah wants you to wish. If they insist that you must follow their wish then proclaim that you will *not* follow their wish, but you will *only* follow Allah's wish, and His wish is that you, who are sitting on the human thrones of authority, must be removed. But how could they tolerate this? In the words of Iqbal: They do not to change themselves but they change the Quran.

Our current translations and interpretations of the Quran

My dear friends, the priesthood at the behest of the kings – who took over the reins of power after the rightly-guided Khalifas of the Prophet (PBUH) – changed the meaning of the Quran. You can pick any translation of the Quran

and you will find there: whoever wants one can choose the way leading towards Allah but you *cannot* will it unless God wills to show you that way. Then, on top of this translation, you will find *Tafsir* (interpretation). Take this next verse: اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ۙ لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّسۡتَقِيۡمَ (81:27-28) – This [message] is no less than a reminder to all mankind, to every one of you who wills to walk a straight way [Asad]. Anyone who is standing on the crossroads and wills to follow the straightway can find out – using Allah's guidance, using His ذِكۡرٌ (reminder), using His signpost – the straightway, the way of الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ (*Siraat-i-Mustaqim*). But one who does not wish to follow this straightway then it is useless for him whether or not there is a signpost at the crossroad. He wants to follow what he wants regardless. Then the Quran says: وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ (81:29). The traditional translation says: But you cannot will it unless God wills [Asad]. This has come in two places in the Quran. As we explained above, the correct meaning of وَمَا تَشَآءُوۡنَ is: whatever you wish it is okay. That is *your* wish; and We do not want to interfere with your wish. It is your wish to choose whichever way you want. But We want that you choose the right way; so therefore you should want what We want. How great this is! How uplifting this is for human beings! You want to know what path We want you to choose? You want to know whose lordship to choose? Well, you should choose the way of that Lord who is Sustainer of all humankind: رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ (81:29) – the Sustainer of all the worlds. This Quran is ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ – reminder and guidance for all humankind from Allah who is رَبُّ الۡعٰلَمِيۡنَ – the provider of nourishment to all of humanity. This is crystal clear. Therefore, you should wish what He wishes for you. That will be the best for you. But you are free to choose any other way. But remember! You will be responsible for that choice. You will have to face the consequences of that choice here, as well as in the Hereafter.

My dear friends, this is the last verse of Surah *Al-Takwir* (التکویر). Surah *Al-Takwir* (التکویر) is finished today. We will next take up Surah *Al-Infitaar* (الانفطار).

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

FOUNDED IN 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL NO. 28
VOL.69
ISSUE
1

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546 , 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
web:www.toluislam.com, www.facebook.com/talueislam/

(12 ربیع الاوّل کی مناسبت سے)

حضورِ رسالت مآبؐ میں

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا
جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا
قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی لیکن
نظامِ کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا
فرشتہ بزمِ رسالتؐ میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیۂ رحمتؐ میں لے گئے مجھ کو

کہا حضورؐ نے اے عندلیبِ باغِ حجاز!
کلی کلی ہے تری گرمی نوا سے گداز
ہمیشہ سرخوشِ جامِ ولا ہے دل تیرا
فتادگی ہے تری غیرتِ سجودِ نیاز
اڑا جو پستی دنیا سے تو سوئے گردوں
سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعتِ پرواز
نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

"حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں"

علامہ اقبالؒ